وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

اکتوبر ۱۹۷۷ء

★

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★

شائع کردہ :

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

چندہ سالانہ ۱۵/- ، قیمت فی نسخہ ...

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۶	ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء	شمارہ ۴

مشمولات

● تذکرہ تبصرہ	ڈاکٹر اسرار احمد	صفحہ	۱
● مطالعہ قرآن (نشری تقریر)	ڈاکٹر اسرار احمد	,,	۵
● دعوت الی اللہ	مولانا وصی مظہر ندوی	,,	۱۸
● علماء کی ذمہ داریاں	صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی	,,	۲۲
● اقبال اور نوجوان	شاہ مصباح الدین شکیل	,,	۲۷
● شرک اور اقسام شرک	ڈاکٹر اسرار احمد	,,	۳۵
● اسلام میں اجتماعیت	مولانا سید محمود الحسن	,,	۵۱
● شہید ناز	مولانا سید جعفر شاہ پھلواروی	,,	۵۳
● ابوالکلامیات	ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی	,,	۵۵
● حاصل مطالعہ	جمیل الرحمٰن	,,	۵۷
● ایک تلخ اور ناخوشگوار معاملہ	ڈاکٹر اسرار احمد	,,	۶۱

مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن

مقام اشاعت : ۳۶ ، کے - ماڈل ٹاؤن - لاہور (فون : ۳۵۲۶۱۱)

ڈاکٹر اسرار احمد (ناشر) نے با اہتمام چوہدری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس - شارع فاطمہ جناح لاہور سے چھپوا کر مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی ، ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن - لاہور سے شائع کیا -

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

تذکرہ و تبصرہ

انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی ہوگئے اور نہ صرف انتخابی بلکہ ہر قسم کی سیاسی سرگرمی پر پابندی لگ گئی۔ اور اس طرح پاکستان کی تیس سالہ تاریخ کے تیسرے مارشل لاء کا دورِ اوّل ختم ہوگیا اور دورِ ثانی شروع ہوگیا۔

موجودہ مارشل لاء کا نفاذ ابتداءً محدود مقاصد اور متعین مدّت کے لیے ہوا تھا۔ اور اس کی نوعیت ملک کے سیاسی و جمہوری عمل میں ایک وقتی رکاوٹ (IMPASSE) کو دُور کرنے والی فوری و عارضی اصلاحی تدبیر (TEMPORARY CORRECTIVE MEASURE) کی تھی۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے 'OPERATION FAIR-PLAY' کے تحت اقتدار سنبھالتے ہی انتخابات کے لیے نوّے دنوں کی مدّت بھی معیّن کردی تھی۔ اور اس عزم کا اظہار بھی کردیا تھا کہ وہ سیاسی عمل کے اہم اور نازک مرحلے یعنی عام انتخابات میں صرف ریفری کا کردار سرانجام دیں گے اور اپنی جملہ مساعی کو صرف آزاد اور غیر جانبدار انتخاب منعقد کرانے پر مرتکز رکھیں گے۔

لیکن جلد ہی صورتِ حال تبدیل ہوگئی، اور بقول خود اُن کے جو حقائق و واقعات ان کے سامنے آئے انہوں نے انہیں ہلا کر رکھ دیا اور وہ 'احتساب' کا عمل شروع کرنے پر مجبور ہوگئے اور اور یہی 'احتساب' کا عمل بالآخر اس پر منتج ہوا کہ انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی اور 'احتساب' کے ساتھ ساتھ 'اصلاحِ حال' اور 'تعمیرِ نو' کی جدّوجہد شروع! اس طرح اب مارشل لاء کے جس دور کا آغاز ہوا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت مشابہ ہے اس پہلے مارشل لاء سے جو ۱۹۵۸ء میں سابق صدر ایوب نے نافذ کیا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی مدّت کتنی طویل ہوگی!

اندریں حالات دو سوالات تو وہ ہیں جو ہر محفل میں گفتگو کا موضوع بنے ہوئے ہیں یعنی ایک یہ کہ اب کیا ہوگا؟ کیا حالات واقعۃً درست ہوجائیں گے؟ یا یہ بھی ایک عارضی وقفہ ہی ثابت ہوگا اور ملک پھر دو متحارب قوتوں کے تصادم کی جولان گاہ بن جائے گا؟ اور آیا یہ ملک

قائم بھی رہے گا یا نہیں ؟ وقس علیٰ ھٰذا ـــــ اور دوسرے یہ کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے؟ ہماری قومی و ملّی زندگی کو استحکام کیوں نصیب نہیں ہو رہا ؟ ہماری ملکی سیاست کی گاڑی کا انجن بار بار بند کیوں ہو جاتا ہے ؟ اور ہم ایک دائرے ہی میں کیوں حرکت کئے چلے جا رہے ہیں ؟ ـــــ اور ایک سوال وہ ہے جس پر ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان کو اپنی سوچ کو مرتکز کر دینا چاہیئے کہ اِن حالات میں کرنا کیا چاہیئے ؟ اور اس مخمصے سے نجات کی سبیل کون سی ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اگرچہ آئندہ کے حالات اُمورِ غیبی کے ذیل میں آتے ہیں، جن کا کوئی حتمی اور یقینی علم سوائے انبیاءِ کرام کے اور کسی انسان کو نہیں ہو سکتا، اور نبوّت کا دروازہ کُلّیتہً اور مستقلاً بند ہو چکا ہے۔ تاہم حالات کی رفتار اور موجود الوقت ظروف و احوال کے تجزیے سے ایک اندازہ ہر سوچنے سمجھنے والا انسان خود بھی قائم کرتا ہے۔ اور اس ضمن میں دوسروں کی رائے بھی معلوم کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم سے بھی بہت سے رفقاء و احباب نے اس قسم کے سوالات کئے جن کا جواب گفتگوؤں میں بھی عرض کیا جاتا رہا ہے اور اب اختصار کے ساتھ تحریراً بھی پیشِ خدمت ہے۔

ہماری رائے میں صورتِ حال اس سے بہت زیادہ خراب اور مایوس کُن ہے جتنی کہ وہ بظاہر نظر آتی ہے۔ اور اس کے باوجود کہ ہمیں نہ صرف یہ کہ جنرل ضیاء الحق صاحب کی نیت پر کوئی شبہ نہیں بلکہ خدا گواہ ہے کہ ہم انہیں ایک نہایت شریف، دیندار اور مخلص مسلمان سمجھتے ہیں، ہمیں مستقبل قریب میں اصلاحِ احوال کی کوئی امید نظر نہیں آتی اور آئندہ کم از کم دس برس تک تو یہی نظر آتا ہے کہ ہماری ملکی و قومی زندگی کی ناؤ ڈولتے ہی چلے گی۔ بلکہ کوئی عجیب نہیں کہ کسی سقوطِ مشرقی پاکستان ایسے بڑے حادثے سے بھی دوچار ہو جائے!

قومی و اجتماعی سطح پر احتساب کا ہمہ گیر عمل، ترویجِ شریعت کی مبارک و مسعود کوشش اور نظامِ تعلیم کی اصلاح اور تعمیرِ نو ایسے اقدامات جن کے لیے سرتوڑ کوشش اس وقت جنرل ضیاء الحق صاحب کر رہے ہیں، کاش کہ ان کا آغاز قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہو جاتا۔ اُس وقت فضا حد درجہ سازگار تھی اور قلوب و اذہان اس کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن افسوس کہ ہم نے نہ صرف یہ کہ وہ موقع کھو دیا بلکہ پورے تیس سال بالکل مخالف سمت میں تیزی کے ساتھ دوڑنے میں صرف کر دیئے اور اب جب کہ ایک انگریزی مقولے کے مطابق وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ کر گزر چکا ہے اور حالات بالکل دوسری انتہا کو پہنچ چکے ہیں، ہم اگر جاگے بھی تو اس

جاگنے سے کیا حاصل ! ــــ بفحوائے الفاظِ قرآنی : ” یَوْمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّکْرٰی “ یعنی ـــ ” اُس روز ہوش آئے گا انسان کو ! لیکن تب ہوش میں آنے کا کیا فائدہ ؟ ‘ یا بقولِ شاعر ؎ : ” جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا ! “

اِس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ملک و ملّت کو اس کے اصل نصب العین سے منحرف کرنے اور قوم کی سیاسی و اجتماعی گاڑی کو پٹڑی سے اُتارنے کے جرم کا اصل مجرم کون ہے ؟ وہ قیادتِ عظمیٰ جو اس ملک کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی تھی یا اُس کے وہ حواری اور ہم سفر جن کی اکثریت کو خود اس نے ” کھوٹے سکوں “ سے تشبیہ دی تھی ، یا وہ نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتیں جنھوں نے چھوٹتے ہی قصرِ قیادت و سیادت اور ایوانِ حکومت پر ہلّہ بولنا لازمی و ناگزیر سمجھا۔ یا وہ علماء و مذہبی پیشوا جنھوں نے صرف ’ تنقید ‘ ہی کو کل فرض سمجھا ‘ یا وہ مہاجر جو آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان آئے لیکن یہاں پہنچتے ہی ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دولت پر بالکل گِدھوں کے سے انداز میں لوٹ کر گرے ، یا وہ مقامی آبادی جس نے پاکستان کے قیام کو اپنے حق میں بالکل ” مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ “ کے مترادف جانا اور اِس خوانِ نعمت کی ذمّہ داریوں کی جانب نگاہ ہی نہ کی ! ـــــ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ جُرم کسی ایک فرد یا جماعت کا نہیں ہے ‘ اس حمّام میں پُوری قوم اور اُس کے تمام طبقات ننگے ہیں - یہ ہمارا وہ اجتماعی جُرم ہے جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک بُھگتیں گے ! (اِس موضوع پر جناب زیڈ اے سلیری صاحب کے ایک مضمون کا عنوان بڑا ہی پیارا تھا ـــــ

("THE LEARNED ALSO FAILED!")

الغرض ! ـــ مجرم اور قصور وار خواہ کوئی بھی ہو اس سے اس اصل صورتِ واقعہ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو اس وقت بالفعل موجود ہے ـــ یعنی یہ کہ مادّہ پرستی اور لادینیّت نے سرطان کے پھوڑے کی طرح ہمارے پورے جسدِ ملّی میں گہری جڑیں جما لی ہیں - اب سے لگ بھگ دس سال قبل تک مادّیت اور الحاد کو معاشرے کے پڑھے لکھے اور اعلیٰ طبقات کے ’ فکری انداز ‘ یعنی INTELLECTUAL CULT کی حیثیت حاصل تھی لیکن ماضی قریب میں ذرائع ابلاغِ عامّہ (MASS MEDIA) کے طفیل SECULARISATION کا یہ عمل قوم کے انتہائی نچلے طبقات تک نفوذ کر گیا ہے اور عوام کی ایک عظیم اکثریت کے قلوب و اذہان شعوری یا غیر شعوری طور پر اس زہر سے مسموم ہو چکے ہیں ـــ اب ظاہر ہے کہ ” مادّیت “ کے

سیلاب کا فطری رُخ "جدلی مادیت" ہی کی جانب ہوتا ہے، لہٰذا آپ چاہیں تو اسے قسمت کی ستم ظریفی (IRONY OF FATE) قرار دے لیں۔ بہرحال واقعہ یہی ہے کہ وہ ملک جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور جسے دورِ جدید میں اسلام کی ایک تجربہ گاہ بنانا مقصود تھا عوامی سطح پر تیزی کے ساتھ 'خالص مادیت' ہی نہیں 'جدلی مادیت' کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور اگر اس دھارے کا رُخ حقیقی روحانیت اور واقعی خدا پرستی کی طرف نہ موڑا جاسکا تو کوئی سطحی اور مصنوعی تدبیر حالات کی رفتار کو نہیں روک سکتی، گویا بقول علامہ اقبال: ؎

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن بیرانِ کلیسا کی دُعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اس عرصے میں مختلف دینی تحریکوں اور مذہبی جماعتوں کے زیرِ اثر قوم کے طبقۂ متوسطہ میں مذہبی رجحان اور شعائرِ دینی کے ساتھ عملی وابستگی میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ 'مذہبیت' اکثر و بیشتر ایک ایسے خالی خول کے مانند ہے جس میں نہ حقیقی روحانیت کی چاشنی موجود ہے اور نہ واقعی خدا پرستی اور آخرت طلبی کی رُوح۔ چنانچہ وہ یا تو نری رسم پرستی (RITUALISM) کی حیثیت رکھتی ہے یا صرف ایک عقلی و ذہنی روش اور ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی انداز (SOCIAL CULT) کی، اِلّا ماشاء اللہ!

لہٰذا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ہمارے یہاں اس وقت اصل تصادم ان ہی نچلے اور متوسط طبقات کے مابین ہے۔ اور ان دونوں طبقوں کے اصل دھاروں (MAIN CURRENTS) کا رُخ بالکل مخالف سمت میں ہو گیا ہے۔ چنانچہ نچلے طبقات تیزی کے ساتھ مادیت، لادینیت اور سوشلزم کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ جبکہ طبقۂ متوسطہ کے فعّال عناصر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر منظم ہو رہے ہیں، اور خاکم بدہن! ہمارے تجزیے کے مطابق اُن کے مابین ایک فیصلہ کُن تصادم ناگزیر ہو چکا ہے۔ اِس پورے معاملے میں دلچسپ تر این امر یہ ہے کہ سب سے اوپر کا طبقہ فی الحال بندر کے مانند ترازو ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے اور دو طرفہ فوائد حاصل کر رہا ہے۔ چنانچہ "غریبوں" کی قیادت کی اجارہ داری بھی اسی کے پاس ہے اور "مذہب" کی سرپرستی کی ٹھیکہ داری بھی! لیکن ہمارا اندازہ یہ ہے کہ یہ 'گھپلا' اب زیادہ دیر نہیں چل سکے گا اور اصل متحارب قوتوں کی یہ صف آرائی (POLARISATION) تیزی کے ساتھ اپنی منطقی انتہا پہنچ کر رہے گی۔ چنانچہ سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے مابین بھی ایک بالکل نئی صف بندی (RE-ALIGNMENT) دائیں اور بائیں بازوؤں کی تقسیم اور مرکزیت پسند اور مرکز گریز رجحانات کے تصادم کی بنیاد پر ہو گی۔ اور اس طرح

ڈاکٹر اسرار احمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

مطالعۂ قرآن
نشری تقاریر

تیسرا گروپ

سُورۂ یُونس، سُورۂ ھُود، سُورۂ یُوسُف

از یکم رمضان المبارک تا ۱۵ء، روزانہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مطالعۂ قرآن کے ضمن میں جو ۱۵ تقاریر نشر ہوتی رہی ہیں، ان میں سے ۱۰ تقاریر ماہِ ستمبر کے شمارے میں ہدیۂ ناظرین کی جا چکی ہیں۔ اس شمارے میں مزید دو تقاریر پیشِ خدمت ہیں۔ (مرتّب)

(تقریر نمبر ۱۱) خلاصہ تفسیر سورۂ یونس و سورۂ ہود

قرآن حکیم میں گیارھویں پارے میں سورۂ یونس سے لے کر اٹھارویں پارے میں سورۂ مومنون تک ۱۴ مکّی سورتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں مضامین اور ربطِ کلام کے اعتبار سے اکثر سورتیں تو جوڑوں کی شکل میں ہیں لیکن بعض بالکل منفرد مزاج کی حامل ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ثانوی اعتبار سے کسی جوڑے ہی کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس طرح بنظرِ غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بڑے گروپ میں تین تین سورتوں پر مشتمل چھوٹے گروپ تشکیل پا گئے ہیں۔ جن میں مضامین کی بڑی مناسبت و مشابہت پائی جاتی ہے۔

ان میں سے پہلا گروپ سورۂ یونس، سورۂ ہود اور سورۂ یوسف پر مشتمل ہے۔ جن میں سے سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں تو بعینہٖ وہی نسبت باہمی پائی جاتی ہے جو ہم اس سے قبل سورۂ انعام اور اعراف میں دیکھ چکے ہیں۔ البتہ سورۂ یوسف بالکل منفرد سورت ہے جس میں از اوّل تا آخر صرف ایک نبی یعنی حضرت یوسف علیہ السّلام کے حالات و واقعات تفصیلاً بیان ہوئے (اس کی ایک ہی اور مثال پورے قرآن میں سورۂ طٰہٰ کی ہے جس میں اسی طرح از ابتداء تا انتہاء حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے حالات و واقعات کا ذکر ہے)

سورۂ یونس اور سورۂ ہود دونوں مکّی دور کے اواخر میں نازل ہوئیں اور غالباً سورۂ ہود سورۂ یونس سے قبل نازل ہوئی۔ ان دونوں اور بالخصوص سورۂ ہود کے مضامین کا انداز ایسا ہے جیسے

عذاب الٰہی آیا چاہتا ہو اور ہلاکت اور بربادی کے سیلاب کا بند بس ٹوٹنے والا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ان سورتوں کے نزول کے زمانے میں آنحضورؐ صدمے کے باعث بوڑھے نظر آنے لگے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا بھی کہ "شَیَّبَتْنِیْ هُوْدٌ وَ اَخَوَاتُهَا" "مجھے ہود اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔

سورۂ یونس اور سورۂ ہود کے مابین جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، وہی نسبت ہے جو سورۂ انعام اور سورۂ اعراف میں کہ ایک میں "تذکیر بآلاء اللہ" پر زیادہ زور ہے اور دوسری میں "تذکیر بایّام اللہ" پر۔ چنانچہ سورۂ یونس کے گیارہ رکوعوں میں سے صرف دو میں قصص المرسلین کا ذکر ہے اور بقیہ پوری سورت میں آفاق و انفس کے دلائل اور فطرت کی بدیہی شہادتوں سے توحید، معاد اور رسالت کو مبرہن کیا گیا ہے۔ جبکہ سورۂ ہود کے دس رکوعوں میں سے سات میں رسولوں کے حالات اور ان کی قوموں پر عذاب کی تفاصیل بیان ہوئی ہیں اور صرف تین رکوعوں میں اصولی مباحث وارد ہوئے ہیں۔ جن رسولوں کا ذکر ان دونوں سورتوں میں ہوا وہ وہی چھ "اُولُوالْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ" ہیں۔ جن کا ذکر سورۂ اعراف میں آچکا ہے یعنی حضرات نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب و موسیٰ علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ ان کے علاوہ صرف ایک رسول یعنی حضرت یونس کا ذکر سورۂ یونس میں مزید آیا ہے لیکن وہ بالکل ضمنی طور پر ——— پھر سورۂ یونس اور سورۂ ہود کے مابین یہ عکسی ترتیب بھی بڑی دلچسپ ہے کہ سورۂ یونس میں ان چھ رسولوں میں سے آخری یعنی حضرت موسیٰؑ کا ذکر نہایت مفصل ہوا اور پہلے یعنی حضرت نوحؑ کا مجملاً ——— اور بقیہ چار کے صرف مجموعی ذکر پر اکتفا کیا گیا جب کہ سورۂ ہود میں حضرت نوحؑ کا ذکر بہت مفصل ہوا اور حضرت موسیٰؑ کا نہایت مجمل، اور بقیہ چار کے ذکر کے لیے بھی پورا پورا ایک رکوع وقف کیا گیا

اولوالعزم رسولوں کے اس ذکر کی اصل اور نمایاں غرض تو ظاہر ہے کہ مشرکین عرب بالخصوص قریش مکہ کو انذار یعنی خبردار کرنا ہے کہ جس طرح تمہارے پاس ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں۔ اسی طرح ہم نے تمہارے ملک اور اس کے اطراف و جوانب کی سابق اقوام کے پاس بھی اپنے رسول بھیجے تھے۔ اور جس طرح تم ان کا انکار کر رہے ہو اور بجائے ایمان کے کفر و اعراض کی روش اختیار کر رہے ہو۔ اسی طرح انہوں نے کیا تھا تو تم جانتے ہی ہو کہ ان کو ہم نے کیسے نیست و نابود اور نسیاً منسیاً کر دیا ——— تو اب خود غور کر لو کہ تم اپنے آپ کو کس انجام کا مستحق بنا رہے ہو! ———

دوسرا اہم پہلو اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اہل ایمان کے لیے بشارت ہے کہ جس

طرح سابق رسولوں اور ان کے ساتھیوں پر مصائب آئے اور اُن کا استہزاء بھی کیا گیا اور اُن پر تشدد بھی کیا گیا۔ لیکن بالآخر کامیاب وہی ہوئے اور اللہ کی تائید و نصرت ان کے شاملِ حال ہوئی اسی طرح بالآخر کامیاب تم ہی رہو گے۔ البتہ اہلِ ایمان کے صبر و ثبات اور عزم و ہمت کا امتحان اللہ ضرور لیا کرتا ہے اس کے لیے تمھیں بھی تیار رہنا چاہیئے۔ چنانچہ سورۂ یونس کا اختتام ہوا ان الفاظ پر کہ: فَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ ۝ (یعنی صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ صادر فرما دے اور اللہ ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے) اور سورۂ ہود کے آخر میں پہلے آیت ۱۱۵ میں فرمایا: (اور صبر کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا!) اور پھر آیت ۱۲۰ میں فرمایا: ان رسولوں کی تمام سرگزشتیں ہم تمھیں اس لیے سنا رہے ہیں کہ ان کے ذریعے تمہارے دل کو قوت دیں، چنانچہ ان میں تمھارے لیے بھی حق الیقین مضمر ہے اور اہلِ ایمان کے لیے بھی نصیحت اور یاد دہانی اور جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ان سے ڈنکے کی چوٹ کہہ دو کہ تم اپنی سی کیے جاؤ، ہم بھی پورا زور صرف کریں گے پھر نتیجہ کا انتظار تم بھی کرو، ہم بھی کریں گے اور آسمانوں اور زمین کا غیب تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے اور اسی کی طرف تمام امور فیصلہ کے لیے لوٹتے ہیں — پس اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو اور جو کچھ تم کر رہے ہو تمھارا ربّ اس سے بے خبر ہرگز نہیں ہے!"

سورۂ یونس میں حضرت یونسؑ کا ذکر بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ ایسا نہ ہو مسلمان حضرت یونسؑ کی طرح جلدی میں کوئی اقدام کر بیٹھیں تو اس کا فائدہ تمام تر کفار کو ہوگا جیسا کہ حضرت یونسؑ کی قوم کو ہوا کہ ان پر آیا ہوا عذاب ٹل گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمان اللہ کی طرف سے کسی تادیبی سلوک کے مستحق ٹھہریں۔ جیسا کہ معاملہ ہوا تھا حضرت یونسؑ کے ساتھ! پس مسلمانوں کو کفار کی تعذیب و ایذاء پر صبر کرتے ہوئے اپنی دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھنا چاہیئے اور فیصلہ تمام تر اللہ کے حوالے کر دینا چاہیئے!

ایمانیاتِ ثلٰثہ یعنی توحید، معاد اور رسالت میں سے ان دونوں سورتوں میں اصل زور رسالت کے اثبات اور بالخصوص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے ثبوت کے طور پر قرآن مجید کے اعجاز پر دیا گیا ہے۔ چنانچہ دونوں سورتوں کا آغاز قرآنِ حکیم کے ذکر ہی سے ہوتا ہے۔ سورۂ یونس میں اختصار کے ساتھ کہ "الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝" (یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں) پھر سورۂ ہود میں کہ: "الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝" (یہ قرآن ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں اور پھر ان کی تفصیل کی گئی اس

ہستی کی جانب سے جو کمال حکمت کی حامل اور ہر چیز سے باخبر ہے!) مزید برآں دونوں سورتوں میں قرآن مجید کے ضمن میں چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر تم اس کے بارے میں شک کرتے ہو کہ یہ محمدؐ کی اپنی تصنیف ہے تو ذرا تم بھی طبع آزمائی کر دیکھو اور تمام خطیبوں، شاعروں اور ادیبوں کو جمع کر کے کوشش کرو کہ اس جیسی دس بلکہ ایک ہی سورت تصنیف کر سکو، چنانچہ سورہ ہود میں فرمایا: "اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝" (یعنی کیا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اسے تم نے خود گھڑ لیا ہے، تو کہہ دو کہ لاؤ اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی، اور اللہ کے سوا جسے چاہو مدد کے لیے بلا لو اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر وہ تمہارا یہ چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کرنا چاہیئے کہ یہ اللہ کے علم ہی سے نازل ہوا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اب بھی اسلام لاتے ہو یا نہیں!) ــــ اور سورۂ یونس میں اس چیلنج کو آخری منطقی حد تک پہنچا دیا کہ: "مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (یعنی یہ قرآن ہرگز ایسی کتاب نہیں ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اسے تصنیف کر سکے!) اور یہ کہ: "اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ (کیا ان کا کہنا ہے کہ اس نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو کہہ کہ اگر تم سچے ہو تو خدا کے سوا جس کو بھی بلا سکو بلا لو اور سب مل کر اس جیسی ایک ہی سورت پیش کر کے دکھا دو!) ــــ اس کے علاوہ دونوں ہی سورتوں میں یہ مضمون بھی وارد ہوا ہے کہ کفار و مشرکین نے تھک ہار کر مصالحت کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ اس قرآن میں قدرے ترمیم کر دو تو ہم تسلیم کر لیں گے، اس خیال سے کہ بالفرض کسی امن پسند اور صلح جو شخص کے دل میں ان کے اس دامِ ہم رنگِ زمیں کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔ سورۂ ہود میں بظاہر آنحضورؐ سے خطاب کرتے ہوئے لیکن اصلاً بطرزِ تعریض کفار کو ملامت کرتے ہوئے فرمایا: "تو شاید کہ تم اپنی جانب کی گئی وحی میں سے کچھ کو ترک کر دو گے اور تمہارا سینہ ان کے اس قول پر بھنچ کر رہ جاتا ہے کہ ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا اور ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔ تو جان لو کہ تمہارا کام صرف خبردار کر دینا ہے، باقی ہر چیز کا اصل ذمہ دار اللہ ہے!" اور سورۂ یونس میں فرمایا: "جب ان کو ہماری آیات بیّنات سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہمارے حضور میں حاضری کا یقین نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ یا تو کوئی اور

قرآن پیش کرو۔ یا اس میں ترمیم کرو۔ کہہ دو! میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے جی سے اس میں تغیر و تبدل کرسکوں، میں تو خود پابند ہوں اس کا جو میری جانب وحی کیا جاتا ہے اور اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو خود مجھے بھی اپنے رب سے بڑے دن کی سزا کا خوف ہے!" — اور یہی ہے وہ بات جو سورۂ یونس کے اختتام پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرکے فرمائی گئی کہ :-

"اتباع کیے جاؤ اس کا جو تمہاری طرف وحی کیا جارہا ہے!" اور آیت ۵۷، ۵۸ میں خطاب عام کے انداز میں فرمائی گئی کہ : يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (یعنی "لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت، سینوں کے امراض کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت و رحمت آگئی ہے۔ کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل کا کرشمہ اور اس کی رحمت کا ظہور ہے تو چاہیے کہ لوگ اس پر شاداں و فرحاں ہوں۔ اس لیے کہ یہ ان سب چیزوں سے بہت بہتر اور قیمتی ہے جنھیں یہ جمع کر رہے ہیں!)

آنحضورؐ کی نبوت و رسالت اور قرآن مجید کے ذکر کے بعد سب سے نمایاں مضمون ان دونوں سورتوں میں انذار کا ہے جس میں اس مرحلے کی مناسبت سے جس میں یہ نازل ہوئی ہیں کافی شدت اور غضبناکی کا انداز پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک جانب سورۂ کافرون کا سا اعلانِ برأت بھی موجود ہے۔ جیسے سورۂ یونس کی آیت ۴۱ میں فرمایا: "اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ بھی کہہ دیں کہ میرے لیے ہے میرا عمل اور تمہارے لیے ہے تمہاری کمائی، تم بری ہو میرے اعمال سے اور میں بری ہوں تمہارے کرتوتوں سے!" اور آیت ۱۰۴ میں فرمایا: کہہ دو اے لوگو! اگر تمھیں میرے موقف کے بارے میں کوئی شک ہے تو سن رکھو کہ میں ہرگز پوجنے والا نہیں ہوں جنھیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا، میں تو اس اللہ کا پوجنے والا ہوں جو تمہاری جانیں قبض کرے گا اور مجھے تو یہی حکم ہوا ہے کہ اس پر ایمان رکھنے والوں میں شامل رہوں!" — اور دوسری طرف عذاب کی بھی شدید دھمکی پائی جاتی ہے، مثلاً سورۂ یونس کی آیت ۴۷ تا ۵۳ میں فرمایا: "ہر امت کے لیے ایک رسول ہوتا ہے تو جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو ان کا قضیہ انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا، اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ ہمارے بارے میں کب پورا ہوگا۔ کہہ دو کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے تو خود اپنے نفع و نقصان کا بھی کوئی اختیار حاصل نہیں، سوائے اس کے کہ اللہ ہی کا فیصلہ صادر ہو جائے — البتہ ہر قوم کے لیے ایک

متعین وقت ہوتا ہے، تو جب وہ متعین وقت آجاتا ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتا ہے نہ آگے، ان سے کہو کہ اللہ کا عذاب رات کو آئے یا دن کے وقت، آخر ان کے پاس حفاظت کا وہ کون سا سامان ہے جس کے بھروسے پر عذاب کی جلدی مچائے جا رہے ہیں۔ تو اے لوگو! کیا تم اس وقت مانو گے جب عذابِ الٰہی آ ہی دھمکے گا؟ اس وقت کہا جائے گا کہ اب ماننے سے کیا فائدہ، جبکہ پہلے تم اس کے لیے جلدی مچاتے رہے، اب تو بس ہمیشہ کے لیے عذاب ہی کا مزا چکھو، یہ تمہاری اپنی کمائی ہے جس کا بدلہ تم پا رہے ہو — اور یہ پوچھتے ہیں کیا واقعی شُدنی ہے جو تم کہہ رہے ہو کہہ دو ہاں میرے رب کی قسم یہ اٹل ہے اور جب وہ آئے گا تو تم ہرگز اس کے قابو سے نہ نکل سکو گے!"

کفار و مشرکین کو انذار کے ساتھ ساتھ ان دونوں سورتوں میں اہلِ ایمان کے لیے تبشیر کا رنگ بھی بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی دوسری آیت ہی میں جہاں حضورؐ کو یہ حکم ہوا کہ لوگوں کو ان کی بدعملی و بدکرداری کے انجام سے خبردار کر دو وہاں ساتھ یہ ہدایت بھی ملی کہ اہلِ ایمان کو بشارت دے دو کہ: "اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (یعنی ان کے لیے اُن کے ربّ کے پاس بڑا بلند رُتبہ ہے!) اور پھر اسی سورت کی آیات ۹، ۱۰ میں اس کی تشریح فرما دی: "جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ اُن کو اُن کے ایمان کی بدولت ان کی منزلِ مراد تک پہنچا دے گا۔ یعنی نعمت کے باغوں میں جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہاں ان کا ترانہ ہوگا حمدِ باری تعالیٰ پر مشتمل، اور آپس کا دعائیہ کلمہ ہوگا سلام! اور آخری بات ان کی یہی ہوگی کہ ساری تعریف اور تمام شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے۔" اور آیات ۶۲ تا ۶۴ میں فرمایا کہ: "آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف کا مقام ہے اور نہ رنج کا اندیشہ، یعنی ان کے لیے جو ایمان لائے اور تقویٰ پر کاربند رہے، ان کے لیے بشارتیں ہی بشارتیں ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں، اور یہی عظیم کامیابی ہے!" اللہ تعالیٰ اپنے کمال فضل و کرم سے ہمیں بھی اس میں سے حصّہ عطا فرمائے۔

آمین یارب العالمین!

(تقریر نمبر ۱۲) خلاصۂ تفسیر سورۂ یوسف

سورۂ یوسف جو قرآن مجید میں بارھویں پارے کے ثلثۂ ثانی قبل شروع ہوتی ہے، اور تیرھویں پارے کے رُبع کے بعد ختم ہوتی ہے۔ ۱۱۱ آیات اور ۱۲ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اور اس

میں سوائے ابتدائی دو اور آخری دس آیات کے از اوّل تا آخر ایک ہی نبی یعنی حضرت یوسف علیہ السّلام کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم میں اس کی کامل مثال تو ایک ہی اور ہے یعنی سُورۂ طٰہٰ، البتہ قریبی مثال ایک اور بھی ہے یعنی سورۂ قصص۔ اور یہ دونوں اسی طرح کُل کی کُل حضرتِ موسیٰ علیہ السّلام کے حالات پر مشتمل ہیں، اور عجب اتّفاق ہے کہ ان دونوں کا گہرا تعلق بنی اسرائیل کی تاریخ سے ہے کہ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں یہ مصر میں داخل ہوئے اور حضرت موسیٰؑ کے عہد میں اُن کا مصر سے نکلنا ہوا۔ مزید برآں ان دونوں کے حالات میں بھی ایک عجیب مشابہت ہے کہ حضرت یوسفؑ کو ان کے اپنے بھائیوں نے حسد کی بنا پر کنوئیں میں ڈالا۔ لیکن اللہ نے اپنے فضل سے انہیں مصر ایسے متمدّن ملک کے دارالحکومت میں نہایت سربرآوردہ گھرانے میں پہنچا دیا۔ اسی طرح موسیٰؑ کو ان کی والدہ نے دشمنوں کے خوف سے اللہ کے اشارے پر دریا میں ڈالا اور انہیں بھی اللہ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے فرعون کے محل میں پہنچا دیا۔ گویا دونوں کے حالات و واقعات کا اصل ماحصل یہ ہے کہ: "وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝" (یعنی اللہ اپنے ارادوں کی تکمیل اور اپنے فیصلوں کی تنفیذ پر پوری طرح قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں!) اس میں گویا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم آپ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے تسلّی اور دلجوئی مضمر ہے کہ اس وقت سرزمینِ مکّہ میں جن ناساعد حالات کا تمھیں سامنا ہے اور جس قسم کی تکالیف اور مصائب نے تمھیں گھیر رکھا ہے ان سے دل شکستہ نہ ہو، اللہ قادر ہے اس پر کہ ظاہری مایوسی کی اس سیاہ رات کا پردہ چاک کر کے اُمّید کی صبحِ روشن طلوع فرما دے اور تمھارے دشمنوں کی مخالفانہ تدابیر ہی کو تمھارے حق میں خیر و برکت اور کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنا دے"۔ اس طرح پوری سورۂ یوسف گویا سورۂ ہُود کے آخر میں وارد ہونے والی آیت: "وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِہٖ فُؤَادَکَ" کی تشریح و تفصیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ مشرکینِ مکّہ نے تو آنحضورؐ کے مکّہ سے ہجرت کر کے چلے جانے کو اپنی بڑی کامیابی سمجھا ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی کو حضورؐ کے تمکّن فی الارض یعنی زمین میں قدم جمانے کا ذریعہ بنا دیا اور کُل دس سال بعد آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم فاتح کی حیثیت سے مکّہ میں داخل ہوئے اور بعینہٖ وہی صورت پیش آئی جو لگ بھگ ڈھائی ہزار سال قبل پیش آئی تھی کہ جس طرح برادرانِ یوسف حضرتِ یوسفؑ کے سامنے شرمندگی اور خجالت کا مجسّمہ بنے کھڑے تھے لیکن حضرت یوسفؑ نے کمال مروّت سے فرمایا تھا: "لَا

تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ اسی طرح جب قریش کے چھوٹے بڑے بھی آنحضورؐ کے سامنے ناکامی اور شکست خوردگی کی تصویر بنے کھڑے تھے تو حضورؐ نے فرمایا تھا: "آج میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے کہا تھا، تم پر نہ کوئی ملامت ہے نہ سرزنش، جاؤ تم سب آزاد ہو!" الغرض سورۂ یوسفؑ کا اصل سبق یہی ہے کہ بندۂ مومن اور داعیٔ حق کو حالات کی نامساعدت و ناموافقت سے ہرگز ہراساں نہیں ہونا چاہیے، اور اسے اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا فرض ادا کیے چلے جانا چاہیے۔ رہے نتائج تو انہیں بالکلیہ اللہ کے حوالے کر دینا چاہیے، وہ اپنی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ سے جب چاہے گا کامیابی کی صورتیں پیدا فرما دے گا۔ ویسے بھی مومن کا اصل مطلوب و مقصود آخرت کی سرخروئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کے حالات و واقعات کو "اَحْسَنُ الْقَصَصِ" سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس موقع پر ان کا ایک خلاصہ بیان کر دیا جائے۔

حضرت یوسفؑ حضرت ابراہیمؑ کے پڑپوتے تھے، اُن کا شجرۂ نسب یہ ہے، یوسفؑ بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیٰ نبیّنا وعلیہم الصّلوٰۃ والسّلام۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو تو حجاز میں بیت اللہ کے جوار میں آباد کر دیا تھا۔ لیکن اپنے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰقؑ کو موجودہ شرقِ اُردن کے علاقے میں آباد کیا تھا۔ چنانچہ وہیں اُن کے فرزند حضرت یعقوبؑ آباد تھے۔ حضرت یعقوبؑ کے دو بیویوں سے بارہ بیٹے تھے، جن میں دس بڑی بیوی سے تھے اور دو چھوٹی سے۔ ان میں سے ایک حضرت یوسفؑ تھے اور دوسرے ان کے حقیقی بھائی بن یمین، حضرت یعقوبؑ کو ان دونوں سے (غالباً چھوٹے ہونے کی وجہ سے بھی) پیار زیادہ تھا لیکن خصوصاً حضرت یوسفؑ سے انہیں شدید محبت تھی۔ ان میں رُشد و سعادت اور ہونہاری کے آثار کی بنا پر بھی۔ حضرت یعقوبؑ کے اس گمان کی توثیق حضرت یوسفؑ کے ایک خواب سے بھی ہو گئی جس میں انہوں نے دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج ان کے سامنے سربسجود ہیں۔ جب حضرت یوسفؑ نے اپنا یہ خواب اپنے والدِ ماجد کو سُنایا تو انہوں نے حضرت یوسفؑ کو اللہ کی جناب میں برگزیدگی کی بشارت سنانے کے ساتھ ساتھ اس خواب کو بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع کر دیا، مبادا وہ حسد کی آگ میں جلنے لگیں اور حضرت یوسفؑ کو کوئی گزند پہنچانے کی کوشش کریں۔ لیکن ان کی اس تمام احتیاط کے باوجود حسد کی چنگاری برادرانِ

یوسف کے دلوں میں بھڑک اٹھی اور انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ اس کانٹے کو راہ سے کیسے ہٹایا جائے۔ بعض کا خیال تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے لیکن سب سے بڑا جو نسبتاً شریف النفس تھا، مُصر ہوا کہ اُس کے بجائے انہیں کسی کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ اس طرح وہ کسی قافلے کے ہاتھ لگ جائیں گے جو انہیں کسی اور ملک میں لے جائے گا۔ اس طرح بھائی کی جان بھی بچ جائے گی اور راستے کا کانٹا بھی ہٹ جائے گا۔ چنانچہ اسی کے مطابق اُنہوں نے حضرت یعقوبؑ سے اجازت چاہی کہ حضرت یوسفؑ کو اُن کے ساتھ شکار پر بھیج دیں تاکہ وہ بھی کچھ کھیل کود لیں حضرت یعقوبؑ نے پہلے تو پس و پیش سے کام لیا اور فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس کی جانب سے غافل ہو جاؤ اور اسے کوئی بھیڑیا پھاڑ ڈالے۔ لیکن پھر ان کے اصرار پر اجازت دیدی۔ انہوں نے اپنی قرارداد کے مطابق حضرت یوسفؑ کو تو کنوئیں میں پھینک دیا اور ان کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا لائے اور والد کی خدمت میں وہی کہانی گھڑ کر پیش کر دی جس کا اندیشہ خود انہوں نے ظاہر کیا تھا۔ انہوں نے ان کی اس بات کو تو نہ مانا تاہم صبر کی روش اختیار کر لی! ــــ اغلب گمان یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کی پیدائش ۱۹۰۶ قبل مسیح میں ہوئی اور ۱۸۹۰ قبل مسیح میں جب آنجناب کی عمر کا سترھواں سال تھا، کنوئیں میں پھینکے جانے کا یہ واقعہ پیش آیا جس میں وہ تین دن رات رہے۔ واضح رہے کہ یہی مدّت ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ ثور میں بسر کی تھی ــــ بہرحال تین دن کے بعد ایک قافلے کا گزر ادھر سے ہوا اور ان کے سقّے نے کنوئیں میں ڈول میں ڈالا تو حضرت یوسفؑ نکل آئے۔ قافلے والوں نے انہیں فروختنی مال سمجھ کر چھپا لیا، وہ مصر جا رہے تھے، وہاں پہنچتے ہی انہوں نے حضرت یوسفؑ کو جلدی سے اونے پونے بیچ ڈالا۔ مبادا ان کا کوئی دعویدار پہنچ جائے اور انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔ مصر میں غلاموں کی منڈی سے حضرت یوسفؑ کو خریدنے والا حکومتِ مصر کا ایک بڑا عہدیدار تھا۔ اس نے انہیں اپنی بیوی کے حوالے کیا اور تاکید بھی کر دی کہ اسے اچھی طرح رکھو، ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو۔ بلکہ کیا عجب کہ اسے اپنا متبنّیٰ ہی بنا لیں! اس طرح اللہ نے حضرت یوسفؑ کی وقت کی سب سے متمدّن مملکت کے ایک بڑے عہدیدار کے گھر میں پرورش کا سامان کر دیا اور خود ان کے مسندِ اقتدار تک پہنچنے کی راہ ہموار کر دی۔ سورۂ یوسف میں اس مقام پر وارد ہوئے ہیں وہ الفاظ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے یعنی :-

"وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝" ــــ!

حضرت یوسفؑ جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو انہیں علم و حکمت سے نوازا اور نبوت سے سرفراز فرمایا اور دوسری جانب مردانہ حسن و وجاہت کا کامل مرقع بنا دیا اور یہی چیز ان کے لیے ایک نئی اور زیادہ مشکل آزمائش کا سبب بن گئی، عزیز مصر کے یہاں اندازاً چھ سال رہنے کے بعد وہ واقعہ پیش آیا کہ اس کی بیوی نے حضرت یوسفؑ کو گناہ کی دعوت دی جس کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے صاف ٹھکرا دیا۔ وہ بدنصیب عورت اس چوٹ سے مزید بپھر گئی اور تریا ہٹ کے انداز میں اس پر تُل گئی کہ یا تو حضرت یوسفؑ اس کے پسندیدہ راستے پر چلیں ورنہ وہ انہیں سخت سزا دلوائے گی یا قید خانے میں ڈلوائے گی اس مرحلے پر حضرت یوسفؑ نے خود بارگاہِ ربانی میں دعا کی کہ "اے ربّ! جس چیز کی یہ مجھے دعوت دے رہی ہیں اس کی نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اور اگر تو نے ہی ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو کوئی عجب نہیں کہ میں ان کی جانب مائل اور جذبات کی رَو میں بہہ جانے والوں میں سے ہو جاؤں" اللہ نے ان کی یہ دعا قبول کر لی۔ اور ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ حضرت یوسفؑ قید خانے میں ڈال دیئے گئے!

قید خانے میں حضرت یوسفؑ نے دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا، اور جب لوگ ان کی شرافت سے متاثر اور خصوصاً ان کی خوابوں کی تعبیر بتانے کی صلاحیت کی بنا پر ان کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ انہیں توحید کی دعوت دیتے کہ "اے میرے زنداں کے ساتھیو! خود غور کرو کہ کیا الگ الگ بہت سے ربّ بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو سب پر غالب و قاہر ہے۔ تم لوگ اسے چھوڑ کر جن کو پوجتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری، اختیار و اقتدار سب اللہ ہی کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی دینِ قیم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے!" ——— زنداں کے ساتھیوں میں سے ایک کو حضرت یوسفؑ نے اس کے خواب کی تعبیر کے ضمن میں بتایا کہ وہ جلد رہا ہو جائے گا اور شاہِ مصر کی ساقی گری پر مامور ہو گا ——— تاریخی اعتبار سے یہ جاننا مفید ہے کہ اس وقت مصر پر فراعنہ کا پانچواں خاندان حکمران تھا جنھیں چرواہے بادشاہ یا HYKSOS KINGS کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اغلباً عربی النسل تھے اور چونکہ خود مصر سے باہر سے آئے ہوئے تھے اس لیے ان کے دلوں میں باہر سے آنے والوں کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا اور غالباً یہی سبب ہے جس کی بنا پر بعد میں انہوں نے بنی اسرائیل کی حد درجہ پذیرائی کی ——— بہرحال ہوا یہ کہ حضرت یوسفؑ کو قید خانے میں لگ بھگ

سات سال ہوگئے تھے کہ ایک رات شاہِ مصر نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر اُس کے درباریوں میں سے کوئی نہ بتا سکا تو اچانک اس کے ساقی کو حضرت یوسفؑ یاد آئے اور وہ بادشاہ کی اجازت سے قید خانے میں ان کے پاس حاضر ہوا اور اُن سے خواب کی تعبیر دریافت کر کے آیا حضرت یوسفؑ نے نہ صرف یہ کہ خواب کی تعبیر بتائی بلکہ مصر پر جو مصیبت آنے والی تھی اُس سے بچاؤ کی تدبیر بھی بتادی بادشاہ اس سے بے حد متاثر ہوا اور اُس نے حضرت یوسفؑ کو قید خانے سے نکال کر نہ صرف یہ کہ اپنے خاص مصاحبین میں شامل کر لیا بلکہ حکومتِ مصر میں کسی نہایت اعلیٰ عہدے پر مقرر کر کے پیش آنے والی مصیبت سے نمٹنے کے لیے کلی اختیارات اُن کے حوالے کر دیئے۔ جب حضرت یوسفؑ اس عہدے پر فائز ہوئے اس وقت ان کی عمر تیس برس تھی اور پورے اسّی سال وہ اس منصب پر فائز رہے!

جس مصیبت کی خبر حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر کے ضمن میں دی تھی وہ ایک خوفناک قحط تھا جس نے نہ صرف مصر بلکہ اطراف و جوانب کے ملکوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ حضرت یوسفؑ نے اس کے لیے غلّے کا جو ذخیرہ کر لیا تھا اُس سے دُور دُور تک کے لوگوں کی جان بچانے کی صورت پیدا ہوگئی اور یہی تقریب ہوئی برادرانِ یوسفؑ کے مصر حاضر ہونے کی۔ وہ جب حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش ہوئے تو آنجناب نے تو انہیں پہچان لیا لیکن اُن کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ جس بھائی کو انہوں نے پندرہ بیس سال قبل کنوئیں میں پھینکا تھا وہی آج عزیزِ مصر کی صورت میں اُن کے سامنے موجود ہے۔ حضرت یوسفؑ نے ان پر رحم کھایا اور انہیں غلّہ وغیرہ دیا لیکن اپنے آپ کو ان پر ظاہر نہ کیا، بلکہ اصرار کر کے اپنے بھائی بن یمین کو بھی مصر بلا لیا اور ایک ایسی تدبیر سے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے پیدا کی اُسے اپنے پاس روک لیا۔ یہ صورتِ حال جاری رہی تا آنکہ وہ وقت بھی آیا جب برادرانِ یوسف کے پاس غلّہ خریدنے کے لیے پھوٹی کوڑی تک نہ رہی اور وہ حضرت یوسفؑ سے غلّے کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے۔ بھائیوں کا یہ حال حضرت یوسفؑ سے نہ دیکھا گیا اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو اُن پر ظاہر کر دیا بلکہ حکم دیا کہ والد ماجد حضرت یعقوبؑ سمیت پورے خاندان کو لے کر مصر آجاؤ اور یہیں سکونت اختیار کر لو! اور اس طرح اسرائیل و بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوبؑ اور ان کے تمام بیٹے اپنے اہل و عیال سمیت مصر منتقل ہوگئے۔ جہاں بادشاہِ وقت نے اُن کی خوب پذیرائی کی۔ مصر کے زرخیز ترین علاقے میں انہیں آباد کیا، اور چونکہ بادشاہِ مصر

حضرت یوسفؑ کا عقیدت مند تھا لہٰذا انہیں مصر میں گویا پیرزادوں کی سی عزت و حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک عرصے کے بعد جب مصر میں ایک قومی انقلاب آیا اور HYKSOS KINGS کا خاتمہ ہوگیا تو بنی اسرائیل پر بھی مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جس سے ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت موسیٰؑ کے ذریعے نجات دی۔

سورۂ یوسف میں حضرت یوسفؑ کی ابتلاء کے ساتھ ساتھ حضرت یعقوبؑ کے ابتلاء اور صبر کا ذکر بھی نہایت سبق آموز طریق پر آیا ہے۔ انہیں حضرت یوسفؑ سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ اور انہیں اللہ کی طرف سے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بقیدِ حیات ہیں۔ چنانچہ ہجر و فراق کا غم انہیں اندر ہی اندر کھاتا رہا یہاں تک کہ جوشِ گریہ سے ان کی بینائی جاتی رہی تاہم زبان سے ہر موقع پر ایک ہی جملہ ادا ہوا یعنی: "فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ" ـــــ اور فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا" یعنی ہر حال میں صبر ہی اہلِ ایمان کے لیے صحیح لائحۂ عمل ہے۔ اور جب گھر والوں نے حد سے زیادہ رنج و غم پر انہیں ٹوکا تو انہوں نے فرمایا: "اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ" (میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اپنے اللہ ہی سے کرتا ہوں!) ـــــ چنانچہ یہی صورت ہمیں سیرتِ نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آتی ہے کہ جب آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ کا انتقال ہوا اور آپؐ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور بعض لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا: "دل یقیناً غم زدہ ہے اور آنکھیں بھی اشکبار ہیں لیکن ہماری زبان پر اس کے سوا کچھ نہیں آئے گا کہ جس چیز میں اللہ راضی ہے ہم بھی اُسی پر راضی ہیں!" ـــــ اور جب طائف میں آنحضورؐ پر پتھروں کی بارش ہوئی اور آپؐ کا جسم مبارک لہولہان ہوگیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استہزاء اور تمسخر کی حد ہوگئی تو وہاں سے واپسی پر جو دلوں کو دہلا دینے والی دُعا آپؐ نے مانگی، اُس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا کہ: "اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْا ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ" (اے اللہ تیری ہی جناب میں شکوہ کرتا ہوں اپنی قوت کی کمی اور وسائل کے فقدان اور لوگوں کے سامنے رسوائی کا!) الغرض سورۂ یوسف میں جہاں حضرت یوسفؑ کی شخصیت کی صورت میں ایک صابر و شاکر اور باہمت و باعفت نوجوان اور ایک اولوالعزم داعیٔ حق اور مبلّغ توحید اور ایک صالح اور مدبّر و منتظم حکمران کا کردار سامنے آتا ہے وہاں حضرت یعقوبؑ کی شخصیت کی صورت میں ایک حد درجہ رقیق القلب اور صاحبِ قلبِ محزون

درویش کا کردار سامنے آتا ہے جو اپنے غم و اندوہ کو اندر ہی اندر پیتا ہے اور اگر کوئی شکایت کرتا بھی ہے تو صرف اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں ـــ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ میں یہ سب اوصاف بیک وقت جمع تھے۔ بالکل صحیح کہا جس نے کہا ؎

حُسنِ یُوسُفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

سورۂ یُوسُف کے آغاز و اختتام پر بھی قرآن کے ایک کتابِ مبین اور مُنزّل من اللہ ہونے کا بیان ہے بلکہ آخری آیت میں تو خود قصّہ یُوسُف کو جو سُورۂ یوسف میں بیان ہوا قرآن کے وحیٔ الٰہی ہونے کی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس لیے کہ ڈھائی ہزار سال قبل کے حالات و واقعات اس قدر صحت و وضاحت کے ساتھ عرب کا ایک اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم اور کیسے بیان کر سکتا تھا: "مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝" ـــ (یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں بلکہ تصدیق ہے اس کی جو پہلے سے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی، اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے) "مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرٰى" کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سورۂ مبارکہ کا ایک ربط و تعلق ہے سورۂ یونس اور سورۂ ہود دونوں سے، اس لیے کہ ان دونوں سورتوں میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: "اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ" گویا ان تینوں سورتوں میں اصل نسبتِ زوجیت تو ہے سورۂ یونس اور سورۂ ہود کے مابین اور سورۂ یوسف ان دونوں کے ساتھ بطورِ ضمیمہ منسلک ہے۔ چنانچہ توحید، معاد، رسالت اور رسولوں کی قوموں پر ان کی دعوت سے اعراض و انکار کی پاداش میں عذابِ الٰہی کے ان مضامین کا ایک خلاصہ بھی اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے جو نہایت شرح و بسط کے ساتھ سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں بیان ہوئے اور اس ضمن میں دو آیتیں نہایت اہم وارد ہوئی ہیں۔ ایک وہ جس میں شرک کی ہمہ گیری کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اکثر لوگ اللہ کو نہیں مانتے مگر کسی نہ کسی نوع کے شرک کے ساتھ اور دوسری میں آنحضورؐ سے کہلوایا گیا ـــ: "کہہ دو یہ میری راہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی، اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں!" ـــ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

دعوت الی اللہ (قسط ۳)

(تاریخ کے آئینے میں)

مولانا وصی مظہر ندوی

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین محمد الامین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ۵

گذشتہ مضمون میں دعوتِ اسلامی یا دعوت الی اللہ کے پہلے مرحلے اور اس کی منازل کا مختصراً ذکر ہو چکا ہے۔ اس مرحلے کی آخری منزل میں جاہلی نظام کے علم برداروں کی جانب سے ظلم و تشدد کی انتہا کر دی جاتی ہے۔ حق کے علم برداروں کو حق سے منحرف کرنے کے لیے ہر ظلم و ستم استعمال کیا جاتا ہے۔ گرم ریت پر ننگے بدن گھسیٹنا، انگاروں پر لٹا کر اوپر سے بھاری پتھر رکھ دینا صنفِ نازک کی دونوں ٹانگوں کو دو اونٹوں کے ساتھ باندھ کر، دونوں اونٹوں کو مخالف سمت میں ہنکا دینا، یہ اور اسی جیسے تمام حربے استعمال کر ڈالے جاتے ہیں۔

اس ظلم و تشدد کے ماحول میں داعی الی اللہ کی للکار معاشرے کے اندر وہی بلونے یا غلّہ کو بھوسہ سے جدا کرنے کے عمل کا ایک وسیع تر نمونہ بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے کا صالح عنصر مکھن کی طرح اُبھر کر سطح پر آجاتا ہے اور غیر صالح چھاچھ یا بھوسہ کی مانند بالکل علیٰحدہ ہو جاتا ہے

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے برأت کی منزل کا آغاز ہوتا ہے۔ اب جاہلی معاشرہ بھی علم بردارانِ حق کو مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ داعی کی کھری کھری تنقید اور معاشرے کے باصلاحیت نوجوانوں اور عوام الناس میں اپنے رہنماؤں کے خلاف اٹھنے والی بغاوت کی لہروں کو اب اربابِ اقتدار کچل ڈالنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے سرداروں کا فیصلہ یہ تھا: ——

ماہنامہ 'میثاق' کی توسیع اشاعت میں تعاون فرمائیے!

قال الملأ الّذین استکبروا من قومہ لنخرجنّک یاشعیب والّذین اٰمنوا معک من قریتنا۔ (سورۂ اعراف آیت ۸۸)

اُن کی قوم کے ان سرداروں نے جنھوں نے تکبّر کیا تھا کہا اے شعیب ہم تم کو اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان سب کو اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے۔

اسی طرح حضرت لوط علیہ السّلام کی قوم نے کہا تھا : اخرجوھم من قریتکم انھم اناس یتطھرون ہ (ان کو ہم بستی سے نکال دیں بے شک یہ لوگ بڑے پاک بنتے ہیں۔) حضرت ابراہیمؑ سے اُن کے باپ آذر نے قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا :۔ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا (اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھ کو سنگسار کر دوں گا اور تو تو مجھ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ ہی دے) حضرت صالح کی قوم کے مفسدین نے فیصلہ کر لیا تھا :

لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ

ہم سب مل کر اس کو اور اس کے اہلِ خاندان کو راتوں رات قتل کر دیں گے اور پھر اُس کے خون کے دعویداروں سے کہہ دیں گے ہم تو اس کے گھر والوں کی ہلاکت کے موقعہ پر موجود نہ تھے۔

یہ فیصلہ بالکل اسی قسم کا فیصلہ ہے جو سردارانِ قریش نے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں کیا تھا کہ رات کے وقت حضورؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا جائے۔ اور جب آپ اندھیرے میں نکلیں گے ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی آپؐ پر حملہ کر کے نعوذ باللہ آپؐ کو شہید کر دے تاکہ بنی ہاشم کسی ایک قبیلہ پر قتل کی ذمّہ داری نہ ڈال سکیں اور خونبہا لینے پر راضی ہو جائیں قریش کے اسی مشورے اور فیصلے کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے :

واذ یمکر بک الّذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک (سورۂ انفال آیت ۳۰)

اور یاد کرو جب تمہارے بارے میں کفر کرنے والے خفیہ تدابیر سوچ رہے تھے تاکہ تم کو گرفتار کر لیں یا قتل کر دیں یا ملک بدر کر دیں۔

جب کفّار اس طرح اہلِ ایمان کو اور خود اپنے رسول کو قتل کرنے یا ملک سے نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں تو پھر داعی کی جانب سے بھی اعلانِ برأت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ وہ اب "اے میری قوم" — "اے انسانو" کے الفاظ سے مخاطب کرنے کے بجائے : ایھا الکافرون ! "اے کافرو!" کے الفاظ سے مخاطب کرتا ہے۔ وہ آخری طور پر کفّار سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے واضح کر دیتا ہے کہ میرا دین تمہارے دین سے یکسر الگ ہے :

قُلْ یَا اَیُّہَا الْکَافِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۝

کہہ دیجئے اے انکار کرنے والو! میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں اُس کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم عبادت کرتے آئے ہو اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین (نظامِ زندگی) ہے اور میرے لیے میرا دین (نظامِ زندگی) ہے۔

اس طرح نظامِ جاہلیت کے عَلَم برداروں کے ساتھ داعئ حق کی کش مکش بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ کفّار کو صاف صاف بتا دیا جاتا ہے:

انا براء منکم و مما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم وبدا بیننا و بینکم العداوۃ والبغضاء ابدًا

(سورۃ الممتحنۃ آیت ۴)

(ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے کہا) بے شک ہم تم سے اور اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو، اُن سب سے اعلانِ برأت کرتے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان (آج سے) ہمیشہ ہمیش کے لیے بغض اور دشمنی کا تعلق رہے گا۔

رسول کے ساتھ ایمان لانے والوں میں سے اگر کچھ لوگ معمولی سی کمزوری یا کفّار کے مقابلے میں کچھ نرمی سے کام لیتے نظر آتے ہیں تو اُن کو صاف صاف بتا دیا جاتا ہے کہ تم حزبُ اللہ سے تعلق رکھتے ہو اس لیے حزبُ الشّیطان کے ساتھ تمہاری دوستی یا روابط کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا:

لا تجد قومًا یؤمنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اٰبآءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ ویدخلھم جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ اولٰئک حزب اللہ الا ان

اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی گروہ کو تم ایسا نہ پاؤ گے کہ وہ ان لوگوں سے محبت رکھے۔ جنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کیا ہو۔ خواہ (یہ دشمنی کرنے والے لوگ) ان (اہلِ ایمان) کے ماں باپ، بیٹی بیٹے، بہن بھائی یا شوہر اور بیوی ہی کیوں نہ ہوں (جو لوگ ایمان کے اس تقاضے پر پورے اترتے ہیں) وہی ہیں جن کے دلوں میں اس (اللہ) نے ایمان نقش کر دیا ہے اور ان کے قلوب میں اپنی جانب سے ایک زبردست

حزب اللہ ھم المفلحون جذبہ پھونک کر ان کی مدد فرمائی ہے اور ان کو وہ ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے دریا رواں ہوں گے۔ اُن میں (وہ) ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی لوگ حزب اللہ (اللہ کی جماعت) ہیں۔ سنو! یقیناً اللہ کی جماعت ہی فلاح پانے والی ہے۔

اس اعلانِ برأت کے ساتھ ہی ساتھ دعوتِ اسلامی کی تیسری منزل یعنی ہجرت کا آغاز بھی ہو جاتا ہے۔ اور اہلِ ایمان اپنے جاہلی معاشرے سے نکل کر کسی ایسی سرزمین کی تلاش شروع کر دیتے ہیں جہاں ان کو قدم جمانے کا موقعہ ملے اور جہاں جا کر وہ دعوتِ اسلامی کا پرچم بلند کر سکیں۔

ہجرت کے ابتدائی مرحلے میں صرف ایسے افراد کو ترکِ وطن کی اجازت ملتی ہے جن پر ان کی قوت برداشت سے زیادہ ظلم و ستم ڈھایا جا رہا ہو۔ مگر اللہ کا رسول اور اُس کے خاص رفقاء اس وقت تک اپنی قوم کو چھوڑ کر نہیں جاتے جب تک کہ وہ قوم سے مکمل طور پر مایوس نہ ہو جائیں یا قوم ان کی زندگی کو ختم کر ڈالنے کا فیصلہ نہ کر لے۔

دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں ہجرت کی منزل ایک اہم موڑ ہے جس کے اثرات بڑے دُور رس ہوتے ہیں۔ اس لیے ہجرت کی منزل اور اس کی اہمیت پر اِن شاء اللہ آئندہ سطور میں گفتگو کی جائے گی۔ اس وقت صرف یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ براءت اور ہجرت کی دونوں منزلوں سے تحریک بیک وقت گزرتی رہتی ہے۔ ایک طرف داعیٔ حق کفّار سے اعلانِ علیحدگی کے لہجہ کو تیز سے تیز تر کرتا چلا جاتا ہے تو دوسری طرف علَم بردارانِ کفر کے مظالم سے تنگ آ کر دعوتِ اسلامی پر ایمان لانے والے ایک صالح معاشرہ کی تخلیق کے لیے نئے مرکز کی طرف ایک ایک، دو دو کر کے ہجرت کرتے رہتے ہیں، گویا ایک فاسد نظام کے بطن سے ایک صالح معاشرہ پیدا ہو رہا ہوتا ہے۔

براءت اور ہجرت ہی نہیں دعوتِ اِلَی اللہ کی ہر بعد والی منزل پہلی منزل کے ساتھ نہ صرف مربوط ہوتی ہے۔ بلکہ دوسری منزل میں پہلی منزل کا کام بھی جاری رہتا ہے۔ چنانچہ دعوت کا کام براءت اور ہجرت کی منزل میں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ان منزلوں میں بھی زور شور کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن۔

اعتذار جولائی اور اگست کے "تذکرہ و تبصرہ" میں اس عاجز کے قلم سے سہواً "پاکستان قومی اتحاد" کا ذکر "متحدہ قومی محاذ" سے منسوب ہوا ہے۔ اس سہو پر اظہارِ معذرت ہے۔ (جمیل الرحمٰن)

عصر حاضر میں

عُلماءِ کرام کی ذمّہ داریاں
اور فروعی اختلافات میں صحیح طرزِ عمل

تحریر صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

حضرات علماء سے بڑھ کر کون اس حقیقت سے آگاہ و آشنا ہو سکتا ہے کہ انبیاءِ کرام کے جانشین اور وارث ہونے کی حیثیت سے ان کی ذمّہ داریاں کتنی عظیم اور بھاری ہیں، ان سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونا کس قدر محنت طلب کام ہے اور اس کے لیے کتنی عزیمت و ہمّت درکار ہے۔ یہ امر ہر شبہ سے بالاتر اور مسلّم الثّبوت ہے کہ انبیاءِ کرام کُلّی اور ہمہ گیر قیادت کے علمبردار بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ان کی بعثت ہرگز اس لیے نہیں تھی کہ وہ باطل سے دب جائیں، یا اس سے مصالحت اور مفاہمت کر لیں، اور نہ ہی وہ اس لیے مبعوث کیے گئے کہ وہ زندگی کے مختلف دائروں میں تقسیم قبول کر لیں اور یہ کہیں کہ امامت و خطابت، نکاح باندھنا اور جنازہ پڑھانا تو ہمارا کام ہے اور معاشرت و معیشت اور سیاست و تمدّن کے دوسرے کام اوروں کے ذمّے ہیں۔ زندگی کی تقسیم کا یہ اصول غیر شرعی اور غیر فطری ہے۔ علماء آگے بڑھ کر اگر زندگی کے میدان میں صحیح رہنمائی کا فریضہ سرانجام نہیں دیں گے اور اس کے لیے ضروری صلاحیّت اور صالحیّت سے اپنے آپ کو آراستہ نہیں کریں گے تو کارزارِ حیات کے قیامت خیز ہنگاموں میں اُن کی آواز کا سنائی دینا تو درکنار مکتب و مسجد سے بھی بالآخر بے دخل ہو کر رہ جائیں گے۔

علمائے کرام اگر اس عہدہ جلیلہ سے باحسن سبکدوشی کو اپنے لیے ضروری قرار نہیں دیتے اور اس وجہ سے معاشرہ پر الحاد و بے دینی کا تسلّط ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں جب پوچھا جائے گا کہ انہوں نے انبیائے کرام کے جانشین ہونے کے ناطے سے احقاق و اعلائے حق، اور ابطالِ باطل کے لیے کیا کچھ کیا تھا؟ تو یہی جواب دیں گے کہ ہم فروعی مسائل پر لڑ جھگڑ کر یہاں حاضر ہوئے ہیں، اور یہ جواب دے کر کس طرح بری الذّمہ قرار پائیں گے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اجتماعی مسائل و معاملات کی زمام کار تھی، ان کا مقابلہ کرنا ہمارے بس میں نہ

تھا۔ اس لیے ہم نے اپنا پورا زورِ علم و استدلال اہلِ دین کی خبر لینے میں صرف کر دیا۔

اس سلسلے میں ایک اصولی بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اعلائے حق کے کام کے لیے اگر کوئی شخص یہ شرط لگائے کہ تمام کلیات و جزئیات میں اہلِ علم کے درمیان کامل اتحاد و اتفاقِ رائے ہو تو یہ شرط نہ پہلے کبھی پوری ہوئی ہے نہ اب ہو سکتی ہے، نہ کبھی پوری ہو سکے گی۔ اس طرح یہ شرط بھی سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے کہ اعلائے حق کا کام کرنے والے صرف متفق مسائل پر ہی زبان کھولیں اور ہر ایسا علمی و تحقیقی کام بند کر دیں جس میں کسی اختلاف کی گنجائش ہو۔

اختلافِ رائے اختلافِ رائے ایک فطری امر ہے، جب بھی دو آدمی کسی دینی مسئلہ پر گفتگو کریں گے تو ضروری نہیں کہ دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں۔ لیکن علمی مسائل میں اختلاف کی کچھ حدود ہیں جنھیں اگر ملحوظ رکھا جائے تو وہ اختلاف رحمت ہوتا ہے۔ اور اُس کے باقی رہتے ہوئے بھی عظیم تر دینی مقاصد کے لیے متحدہ کوشش کی جا سکتی ہے بخلاف اس کے اگر ان کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ادنیٰ اختلاف بھی بڑے جھگڑے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اور اُس کے ہوتے ہوئے کسی بڑے سے بڑے مقصد کے لیے متحدہ سعی و کوشش کے تمام امکانات یکسر معدوم مفقود ہو جاتے ہیں۔ جس چیز کو علمی اختلاف کہتے ہیں وہ ہمیشہ نیک نیتی کے ساتھ ہوا کرتا ہے معقولیت اور سنجیدگی کے ساتھ ہوتا ہے، اہلِ علم حلقوں تک محدود رہتا ہے، علمی استدلال کے ساتھ کیا جاتا ہے، ایک دوسرے کی علمی و دینی عزت و توقیر ملحوظ رکھ کر کیا جاتا ہے، اور فریقین اس امر کے لیے پہلے سے تیار ہوتے ہیں کہ دوسرے کی دلیل اگر وزنی ہو تو اُس کی رائے قبول کریں گے۔ اگر بصورتِ دیگر دوسرے کی دلیل مطمئن نہیں کر سکتی تو اختلاف باقی بھی رکھا جا سکتا ہے۔

ہر وہ اختلاف جو مستقل نزاع کی صورت اختیار کرے وہ کسی بھی فریق کے لیے سود مند نہیں ہوتا۔ ایسے اختلاف کی بنا دو وجوہ پر ہے، ایک یہ کہ جب لوگ کسی قرآنی حقیقت کی اپنے الفاظ میں توجیہ و تعبیر کرتے ہیں اور قرآن کی حدود سے آگے بڑھ کر تشریحات پیش کرتے ہیں اور وہ تشریح از قبیلِ تحریف ہوتی ہے تو زبردست اختلاف کی گنجائش نکل آتی ہے۔

دوسرے یہ کہ جب لوگ اپنے آپ کو ایسے سوالات کے جواب دینے کا مکلف سمجھتے ہیں جن کی تکلیف خدا اور رسول نے ان کو نہیں دی تھی تو نزاع کا دروازہ کبھی بند ہونے

سے بیے کھل جاتا ہے۔ اس پر بھی بات نہ بڑھے اگر ایک شخص اپنے بیان پر اور دوسرا اس کی تردید پر قناعت کرے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ایک شخص اپنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسے عین قرآن کی بات کہتا ہے، اور اُس کے منکر کو قرآن کا منکر ٹھہراتا ہے اور دوسرا شخص اس کی تردید پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ فتوے کی صورت میں جو منہ میں آتا ہے اس کو بغیر ہچکچاہٹ کے اُگل دیتا ہے۔ حالانکہ امرواقعہ یہ ہے کہ جس دین کو کروڑوں انسان اختیار کریں اور جس کے ماخذ ہزاروں اور لاکھوں انسان مطالعہ کریں تو اس کے نصوص کی تعبیر، احکام کی تفصیل، جزئیات کی تحقیق اور مسائل کی توجیہ میں اتفاق کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اختلاف تو ایسی صورت میں فطرتاً پیدا ہوتا ہے اور ایسا اختلاف تحقیق و اجتہاد کے ذیل میں آتا ہے۔ لیکن ان بے شمار اختلافات کے اندر ایک جوہری وحدت ہوتی ہے اور وہ ان اساسی عقاید و اُصول اور ان بڑے بڑے احکام کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جن میں سب متفق پائے جاتے ہیں۔ اگر لوگ اصل اہمیت اس بنائے وحدت کو دیں اور جزوی اختلافات کو اپنی جگہ پر رکھیں تو کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی۔ مگر جب لوگوں کے لیے اصل اہمیت ان جزوی اُمور کو ہوجاتی ہے تو تفرقہ رُونما ہوجاتا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اتحاد و اتفاق کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپس میں کسی طرح کا اختلاف نہ ہو۔ اس لیے ہمیں بھی اتفاق و اتحاد کی حُدود متعیّن کر لینی چاہئیں۔ یعنی اختلاف و اتفاق کے دائرے الگ الگ ہوں۔ ایک عالم کو کسی مسئلہ میں دوسرے عالم سے اختلاف ہے تو اختلاف کا اثر اُسی مسئلہ تک محدود ہونا چاہیئے، یہ نہ ہو کہ اس اختلاف کی وجہ سے دیگر تمام تر دینی و علمی تعلقات کمزور پڑ جائیں، جن کا اختلاف سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں نہایت عمدہ مثال امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا ایک واقعہ ہے۔ امام مسلمؒ نے قسم حدیث کے شرائط اتصال میں امام بخاریؒ سے اختلاف کیا اور وہ امام بخاریؒ کے دلائل سے مطمئن نہ ہوسکے۔ اور یہ اختلاف اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں امام بخاریؒ کا مذہب بیان کرکے لکھتے ہیں کہ : "یہ مذہب محض لغو اور باطل ہے اور اس قابل نہیں کہ اس کے ردّ کی طرف توجّہ کی جائے"۔ اس اختلاف کے باوجود جب امام بخاریؒ سے ملنے گئے تو نہایت محبّت اور عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا کہ : "اجازت دیجیے تاکہ میں آپ کے قدم چوم لوں"۔ قرونِ اُولیٰ میں اسی اصول پر عمل ہوتا تھا یعنی اختلاف و اتفاق کی جُدا جُدا حدود تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اختلاف کے اس دور میں مسلمانوں کی اجتماعی قوتیں باطل کے خلاف استعمال ہوتی تھیں۔ صحابہ کرامؓ بیسیوں

مسائلِ شرعیہ میں مختلف الرّائے تھے۔ لیکن اہم مقصد کی تکمیل کے لیے متحد و متفق تھے اور اس مقام پر اختلاف کا پرتو تک نہ تھا۔

آج جس چیز کے سبب مسلمانوں کی ہوا اُکھڑ گئی ہے، جس نے مسلمانوں کی طاقت کو مفلوج کر دیا ہے، جس کی وجہ سے حکومت کی نگاہ میں اس گروہ کی عظمت نہیں رہی اور جس کے باعث مخالفین کو ہم پر طنز و تمسخر کا موقعہ ملا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اختلاف و اتفاق کو ان کی اصل حدود میں نہیں رہنے دیتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فروعی مسائل میں علمی انداز میں نقطۂ نظر کا اختلاف بمنزلۂ اتفاق ہے — اختلاف کی حقیقت تو علیحدگی اور الگ الگ فرقے بنانا ہے اور علمی انداز میں اختلاف سے فرقے نہیں بنا کرتے۔ فرقہ بندی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اختلاف میں "خواہشِ نفس اور تعصب" کی آمیزش ہو۔ قرونِ اُولیٰ میں بے نفسی اور اخلاص بدرجۂ اُتم موجود تھا، اس لئے وہ نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے اعترافِ عظمت اور مدح و تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک دوسرے سے استفادہ میں قطعاً عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ حنفیہ اور مالکیہ کے درمیان فقہی مسائل میں جو مشہور اختلافات ہیں وہ کسی بھی اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوصف امام محمدؒ جو حنفی المسلک اور امام اعظمؒ کے تلمیذِ خاص ہیں، امام مالکؒ سے شاگرد بن کر استفادہ و استفاضہ کرتے رہے۔ امامِ اعظمؒ جو آسمانِ علم کے درخشندہ آفتاب اور تابندہ ماہتاب ہیں امام مالکؒ سے آپ کا فروعی مسائل میں اختلاف ڈھکا چھپا نہیں۔ پھر بھی بارہا امام مالکؒ کے درسِ حدیث میں شرکت کی۔ ان قابلِ قدر حضرات میں اختلاف کے باوجود اعتماد کا جذبہ صرف اور صرف اس سبب سے تھا کہ وہ اصل مقصد میں متحد و متفق تھے۔

کرنے کے اصل کام | موجودہ پُرآشوب دَور میں علماء پر ملّتِ اسلامیہ و اُمّتِ مسلمہ کی طرف سے چند فرائض عاید ہوتے ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا اُن کا فرضِ منصبی ہے:

اوّلاً مختلف سامراجی اور جارحیّت پسند قوموں کے مقابلہ میں عالمِ اسلام بالعموم اور وطنِ عزیز پاکستان بالخصوص جس شدّت کے ساتھ ملّی وحدت اور ایمانی اخوّت کا محتاج ہے۔ اُسے قائم کرنے اور مضبوط بنانے کی سب سے زیادہ ذمّہ داری علمائے دین پر ہے۔ اس ذمّہ داری کو وہ اسی وقت ہی ٹھیک طور پر ادا کر سکتے ہیں، جب خود ان کی صفوں میں انتشار نہ ہو۔ ان کے ادارے تنظیمیں، اور ممتاز و سربرآوردہ افراد افتراق انگیز باتوں سے پرہیز کریں۔

ثانیاً علمائے کرام کے لیے سب سے بڑھ کر اور قابلِ توجّہ مقصد اسلامی نظام کا قیام، اسلامی

قوانین کا اجراء، اسلامی ماحول کی تشکیل اور عوام النّاس میں اسلامی شعور اور کردار کی تعمیر۔ اس مقصد کے حصول کی راہ میں انہیں دراصل جن مزاحم قوّتوں کا سنگین مقابلہ درپیش ہے وہ ہیں ملحدانہ نظریات، مادّہ پرستانہ تہذیب، عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں سرمایہ داری اور اشتراکیّت، جنسی بے راہروی، بے پردگی اور عریانی کا سیلاب اور اخلاق سوز ثقافت کی ترویج، ان قوّتوں کے علمبردار متّحد و متّفق ہو کر ایک طرف مسلم معاشرہ کو گمراہ کر رہے ہیں اور دوسری طرف اربابِ اقتدار و اختیار کو اُکسا رہے ہیں کہ وہ دینی تعلیم کے اداروں کو ختم کر دیں۔ ان حالات میں علمائے کرام نے اگر آپس کی گروہ بندیاں ختم نہ کیں اور اپنی قوّتیں چھوٹے چھوٹے باہمی تنازعات میں صرف کر دیں اور موجودہ طاغوتی دور کے حملہ سے غفلت برتی تو نتیجہ ہر ایک کے سامنے واضح ہے۔

ثالثاً وعظ گوئی جو بندگانِ خدا کو خوفِ خدا دلانے اور رحمتِ خداوندی پر امید رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ وعظ گوئی فروعی اختلاف رکھنے والوں کے لیے سخت سست الفاظ کہنے کا مجموعہ بن جائے تو نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ علمائے کرام اپنے منصب سے فروتر باتوں میں اُلجھ جائیں گے، سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ عوام النّاس ان افتراق انگیز مواعظ سے بیزار ہوتے چلے جائیں گے، جس سے اسلام دشمن طاقتوں کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے اور اُن کی کارروائیاں ایک نیا رُخ اختیار کر لیں گی۔

رابعاً اسلام کا پیغام پھیلانے والے مختلف مدارس و مکاتبِ فکر کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے مسالک کے علماء سے باوجود اختلاف رکھنے کے ان کے مسلک کی تعصّب انگیز تردید سے احتراز برتیں، اور اپنے مسلک کی مثبت تعلیمات کو سنجیدہ طریقے سے پیش کرنے کی عادت ڈالیں۔ اختلاف اس قدر ہو کہ وہ جنگ و جدل کا نمونہ نہ بنے۔ اختلاف کے اندر احقاقِ حق، افہام و تفہیم اور خیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ اس میں حدودِ شرعیہ بہر طور ملحوظ ہیں اور آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوہ حسنہ کو پیشِ نظر رکھ کر پاکیزہ زبان اور سنجیدہ بحث کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔

اختلاف کو کھینچ تان کر تفرقہ کی بنیاد بنا دینا، بغیر قطعی الدّلالۃ ثبوت کے ایک دوسرے کی تفسیق و تضلیل کرنا، نمازیں الگ کرنا، گھٹیا زبان استعمال کرنا، جذباتیت سے بھرپور عوام النّاس کو اشتعال دلانا، اور بے بنیاد الزامات کی بوچھاڑ کرنا خوفِ خدا اور خوفِ آخرت کی خوفناک

(بقیہ صفحہ ۵…)

شیخ مصباح الدّین شکیل ایم اے، ایل۔ بی۔ بی (کراچی)

اقبال اور نوجوان!

اقبال نہ نرا شاعر ہے نہ فلسفی۔ وہ ان دو شخصیتوں کا حسین امتزاج ہے۔ اس کے کلام میں سوز، گداز، ترنّم اور دلکشی بھی ہے اور اس کی باتوں میں زندگی کے گہرے مسائل کا تجزیہ، صورتِ کائنات کا ذہنی ادراک اور حقائق کا تلخ جائزہ بھی۔ اس کے پاس نہ غالب اور داغ کی نشاط انگیزی ہے نہ حالی کا مؤثر ناصحانہ انداز۔ وہ اکبر کی طرح قنوطیت پسند بھی نہیں وہ ماضی پر مرثیہ نہیں پڑھتا بلکہ حال کے آئینہ میں عظمتِ رفتہ کا عکس اور مستقبل کی جھلک دیکھتا ہے۔ اُس نے ہمیشہ "آئینۂ دوش" میں "صورتِ فردا" کو دیکھا ہے۔ یہ بات بغیر کسی تعلّی کے صاف صاف کہہ بھی دی ہے۔ ع:

من صدائے شاعرِ فرداستم

اگر وہ "شاعرِ فردا" ہے تو لاعلمی کے پردوں کے پیچھے مستقبل جن حقیقتوں کا آئینہ دار ہے اس کا عکس بھی اس کے "آئینۂ ادراک" میں ہونا چاہیئے۔ وہ ان تجلّیوں کا پرتو کس پر ڈالے؟ اس کے مخاطب بھی تو مستقبل کے معمار ہونے چاہئیں۔ وہ اپنے ہمراہیوں میں یہ دم خم نہیں دیکھتا۔ اس کا اظہار یوں کرتا ہے۔ ع

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن

اُس کی ساری توقّعات نوجوانوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ حجاب کی یہ منزل ہے

سنائی کے ادب سے میں نے غوّاصی نہ کی ورنہ ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالہ

طے ہو جاتی ہے۔ وہ قلندرانہ شان سے آگے بڑھتا ہے تاکہ ع

زمانے کے سمندر سے نکالے گوہرِ فردا

ذہنی ارتقاء کی منزل "جاوید نامہ" تک پہنچتے پہنچتے شاعر کو احساس ہو جاتا ہے کہ ایک جہان اُس کے ساحلِ فکر پر کھڑا آرام کر رہا ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن کے پاؤں کنارے پر ہیں، لیکن اُن کی آنکھیں موجوں کی اس کشاکش کا جائزہ لینے سے قاصر ہیں۔ جس سے نہنگوں کی نشیمن

زیرِ دریا تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ اس عالمِ بے کسی کو دیکھ کر وہ سراپا دعا بن جاتا ہے ؎

بر جوانان سہل کن حرفِ مرا
بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

ہر بڑے شاعر کی کوئی نہ کوئی نمایاں تشبیہ ہوا کرتی ہے۔ اس تشبیہ کے پردے میں وہ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو جلوہ گر دیکھتا ہے۔ ورڈسورتھ کے کلام میں بار بار بلبل کا ذکر آتا ہے جو راگ و رنگ کا مظہر ہے۔ شیلے نے اسکائی لارک (SKY LARK) کو اپنی شاعری کی نمایاں تشبیہ بنایا ہے۔ ورڈسورتھ کا بلبل صرف "فردوسِ گوش" ہے شیلے کی اسکائی لارک آسمانوں کا تارا تو بن سکتی ہے لیکن یہ چھوٹی سی چڑیا محض ذوقِ پرواز کا شکار ہے۔ اور بھی فکرِ تعمیرِ آشیانہ ہر لمحہ آسمانوں کی بلندی سے بھی اسے پستی کا ہم خیال رکھتی ہے۔ مشرق کے اس فلسفی شاعر نے "شاہین" کو منتخب کیا ہے، شاہین کی تشبیہ محض تشبیہ نہیں بلکہ شاعرِ مشرق نے اس پرندمیں اسلامی فقر کی خصوصیات دیکھی ہیں جبھی تو اسے چُنا ہے۔

۱- خود دار اور غیرت مند ہے کہ کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، اپنی کوشش سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے۔ ع

شکارِ مردہ سزاوارِ شہباز نہیں!

۲- وہ جدّ و جُہد ہی کو لطفِ زندگی سمجھتا ہے ؎

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں!

۳- بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا ؎

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کیلئے ذلّت ہے کارِ آشیاں بندی

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

یہی مسلمان کی فطرت ہے ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اُس کا نہ پارس، نہ سمرقند نہ بخارا

۴- بلند پرواز ہے۔

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

۵۔ خلوت پسند ہے! ؎

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

۶۔ تیز نگاہ ہے۔

اقبال کی خواہش ہے کہ قوم کے نوجوان "شاہیں بچے" بنیں اور ان خصوصیات سے متصف ہوں جو شاہین میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لیے وہ جِدّ و جُہد اور سعی و عمل پر بڑا زور دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک آرام و راحت زاغ و زغن کا حصّہ ہے اور جُہدِ مسلسل قسمتِ شاہیں کی سعادت ؎

شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست کیں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

وہ خطروں میں گھر جانا، طوفانوں سے لڑ جانا، موجوں کے سر چڑھ جانا اصل زندگی سمجھتے ہیں ؎

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد

دنیا کے سامنے جب اقبال نے اپنا ذہنی شاہکار "جاوید نامہ" پیش کیا تو اس وقت بھی وہ اپنے اصلی مخاطب کو بھولا نہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک حصّہ "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے بڑھا دیا ہے۔ اس میں وہ نوجوانوں کی خدمت میں اپنا خونِ جگر اور اور برسوں کی سعی و کاوش کا حاصل پیش کرتے ہیں۔ انہیں وہ موتی دیئے ہیں جن کی آب میں زمانہ شاید ہی کمی لائے۔ "شاہیں" بننے کی عملی تدبیریں اور گُر اسی حصّے میں ملتے ہیں۔ جاوید ــــ (اقبال کے صاحبزادے) اقبال کے نزدیک نژادِ نو یعنی نئی نسل کا نمائندہ ہے اسی لیے اس حصّہ کا دوسرا نام "سخنے بہ نژادِ نو" رکھا گیا ہے۔ جاوید کے نام سے ساری نوجوان نسل ان کی مخاطب بن جاتی ہے۔

اِس گفتگو کی ابتدا اقبال اس طرح کرتے ہیں کہ سینکڑوں باتیں مَیں نے بے حجاب کہی ہیں۔ لیکن ایک نکتہ ایسا بھی ہے جو ضبطِ تحریر میں نہیں آسکتا۔ اگر کہنے کی کوشش کی جائے تو پیچ در پیچ ہو جاتا ہے۔ حرف و صوت اسے واضح کرنے کی بجائے اور پیچیدہ اور بعید از فہم کر دیتے ہیں۔ یہ جذبِ دروں ہے اور اسے حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے ؎

سوزِ او را از نگاہِ من بگیر یا ز آہِ صبح گاہِ من بگیر!

اقبال نے اس عہد کے نوجوانوں کا جائزہ لیا ہے، انہیں تولا ہے، انہیں پرکھا ہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچے ہیں ؎

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ شیشہ رُو تاریک جاں روشن دماغ

کم نگاہ و بے یقین و نا امید — چشمِ شاں اندر جہاں چیزے نہ دید
عقل ہا بے باک و دلہا بے گداز — چشم ہا بے شرم و غرق اندر مجاز!
قلب او بے واردات لَو بہ لَو — حاصلش را کس نہ گیرد باد و جو!

دوسرے الفاظ میں ع : مردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس۔

اہلِ مشرق اپنے آپ سے بیگانہ ہیں۔ اُن کی نظریں غیر بیں ہو گئی ہیں۔ ان کے قلب وارداتِ نو بنو سے ناآشنا ہیں۔ عقل، دانش، دین، ناموس، اور ننگ کی ساری صلاحیتیں جو کبھی اُن کا طرۂ امتیاز تھیں آج اہلِ فرنگ کی محتاج ہو گئی ہیں۔ تہذیبِ حاضر کی چمک نے اُن کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ہے۔ وہ جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری پر مسحور ہو گئے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر اقبال کا دل سینہ میں خون ہو جاتا ہے اور وہ طلسمِ مغربی کا سحر توڑتے ہیں۔ مشاہدہ اور تحقیق کے ہتھیاروں سے اس بت کو منہ کے بل گراتے ہیں۔

تا ختم بر عالمے افکارِ اُو، — بر دریدم پردۂ اسرارِ اُو!
درمیانِ سینہ دل خوں کردہ ام — تا جہانش را دگرگوں کردہ ام!

اس منزل پہ پہنچ کر سیلِ معانی کا ضبط بڑا مشکل تھا : ع

کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر!

خردمندانِ مغرب اور پروردگارانِ مغرب، اقبال کا مقابلہ ان دونوں سے تھا۔ مقابل کی طاقت کے لحاظ سے ہتھیار کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کو زیر کرنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جو عصرِ حاضر کو پسند اور مرغوب ہے یعنی فلسفہ اور تنقید کا۔ کہتے ہیں اہلِ مغرب صرف فکر کے عادی ہیں، ذکر کی گرمی سے اُن کے دل گداز نہیں۔ لیکن اہلِ مشرق ذکر و فکر دونوں کے وارث ہیں اور یہی اقبال کے نزدیک زندگی کے بارے میں مغرب اور مشرق کے APPROACH (رسائی) کا بنیادی فرق ہے : ع

فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر!

نوجوانوں کی حالت دیکھ کر ان کی آہِ سرد نکل جاتی ہے۔ جنھیں نہ فکر سے مَس ہے نہ ذکر سے ع : اے تو بادا وارثِ ایں فکر و ذکر! مدرسہ، کالج جہاں ماں کی گود کے بعد ان کا نانا بنا جاتا ہے، اپنے مقصود ہی سے واقف نہیں۔ جذبِ اندروں پیدا کرنا داخلِ نصاب ہی نہیں۔ وہ تو صرف ع کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار! نورِ فطرت یعنی ذکر کیلئے

مکتب اور کالج میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسی لیے تو ایک بھی گلِ رعنا اس شاخ سے نہ پھوٹا۔ یہ ادارے علم کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہیں۔ جب علم ہی نہ ہو تو رعنائی افکار کہاں ؟ علم کیا ہے ؟ خود ہی اس کی تشریح کی ہے ؎

علم ناسوزے نہ گیرد از حیات　　دل نہ گیرد لذّتے از واردات
علم جز شرحِ مقاماتِ تو نیست　　علم جُز تفسیرِ آیاتِ تو نیست
علم حق اوّل حواس آخر حضور　　آخرِ او مے نہ گنجد در شعور

علم جب تک زندگی سے سوز حاصل نہ کرے یعنی حیات کا ترجمان نہ ہو اس وقت تک دل واردات سے لذّت حاصل نہیں کرتا۔ علم انسان ہی کی شرح اور اس کی نشانیوں کی تفسیر ہے۔ علم میں حواس (فکر) اور حضور (ذکر) دونوں شامل ہونے چاہیں۔

علم کے حقیقی مفہوم کی وضاحت کے بعد وہ ترویج خودی کے طریقے بتاتے ہیں تشنہ لب نوجوانوں کے لیے دراصل یہی مقام ہے جہاں سامانِ سیری بھی ہے اور مئے زندگی بھی ؎

غافل نہ ہو خودی سے کر اس کی پاسبانی　　شاید کسی حرم کا تو بھی ہو آستانہ

ترویجِ خودی کی پہلی شرط "صاحبِ دل" کی تلاش ہے۔ یہ "مردِ حق" پہلے خود ذکر اور فکر کی بھٹی میں جلتا ہے پھر دنیا کو اپنی نظر سے درس دیتا ہے۔ اس کا کرشمہ ہی کچھ اور ہوتا ہے، اس کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ اہتمامِ کائنات کا واقف ہے۔ لیکن اس عہد میں "مردِ حق" کہاں ؟ اقبال کو نوجوانوں پر رحم آتا ہے۔ وہ جاوید سے کہتے ہیں اے پسر! مجھے اس عصر پر ترس آتا ہے جس میں تو پیدا ہوا ہے۔ اب دنیا مادیّت میں غرق ہو رہی ہے، رُوح سے غافل ہے۔ سارے کرشمے "بدن" تک ہیں۔ "جان" کا کسی کو دھیان نہیں۔ جب یہ کیفیّت عام ہو جاتی ہے تو ؎

چوں بدن از قحطِ جاں ارزاں شود　　مردِ حق در خویشتن پنہاں شود!

اِس مخفی "مردِ حق" کی تلاش جاری رکھ۔ ذوقِ طلب کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔ بہت رکتے رکتے کہا ہے، اگر پھر بھی کوئی نہ ملے تو ؎

گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر　　از اب و جدّ آنچہ من دارم بگیر

یہ الف بے جو کچھ مَیں جانتا ہوں مجھ سے سیکھ۔ مَیں نے یہ سب کچھ پیرِ رومی سے سیکھا ہے۔ اُسی کے سوز سے مَیں صاحبِ دل ہوں، ورنہ میری حقیقت نقشِ آب و گل سے زیادہ نہیں۔ اگر ہو سکے تو تو بھی اُسی کا دامن پکڑے پیرِ رُومی را رفیقِ راہ ساز ÷ تا خدا بخشد ترا سوز و گداز !

ترویج خودی کی دوسری منزل تزکیۂ نفس اور تجزیۂ نفس ہے۔ احساسِ خودی کو تیز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کم کھائے، کم سوئے اور کم گفتگو کرے۔ اُس کے سامنے ہمیشہ اپنی ذات اور نصب العین رہنا چاہیئے۔ غور، فکر، تدبّر، تزکیہ اور تجزیہ یہ وہ دائرہ ہے جس کا محور خودی ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ؎

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش — گردِ خود گردندہ چوں پرکار باش!

حق کا منکر کافر کہلاتا ہے، میرے نزدیک خود اپنا منکر کافر سے بدتر ہے ع

خودی کو نگاہ رکھ ایازی نہ کر!

تعمیرِ خودی کا تیسرا حربہ "شیوۂ اخلاص" ہے یعنی پاک خیال، بلند مقصد اور جائز طریقۂ حصول۔ اگر انسان اس پر مستحکم ہو جائے تو میر و سلطاں، حاکم و افسر کا خوفِ باطل دلوں سے نکل جاتا ہے۔

دوستی ہو کہ دشمنی عدل اور انصاف پیشِ نظر رہے، فقر ہو کہ دولت اعتدال کی راہ چھٹنے نہ پائے۔ خیر الامور اوسطھا

عدل در قہر و رضا از کف مدہ — قصد در فقر و غنا از کف مدہ

زندگی میں کوئی سخت مقام آجائے اور حکمِ ربّ مشکل نظر آئے تو تاویلیں مت ڈھونڈ، بہانے مت بنا اور نہ ہی "حدیثِ دیگراں" سے فائدہ اُٹھا، اس کٹھن اور نازک مرحلہ پر ضمیر کو راہ نما بنا ع روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر! یہی جائز طریقۂ حصول ہے ؎

حکم دشوار است، تاویلے مجو! — جز بقلبِ خویش قندیلے مجو!

ترویجِ خودی کی چوتھی منزل ذکر و فکر ہے، اِس سے غافل مت رہ کہ یہی فقرِ قرآن ہے، اگر ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی چھوڑا تو کامل نہ ہو سکے گا، کاملیّت بجز حفظ جان و تن ممکن نہیں۔ اہلِ یورپ نے فکر کا طریقہ اپنایا، مادیّت کا لبادہ اوڑھ لیا اور اس مقام پر پہنچ گئے ؎

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو ❊ اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ

پیکرِ انسانی کے دو اہم جز عقل اور دل ہیں، ان کا حاصل روح کے بھی اہم عنصر ہیں۔ عقل کا نتیجہ فکر ہے، دل کا وظیفہ ذکر ہے۔ فکرِ مسلسل عقل کی غذا ہے اور ذکرِ پیہم دل کو بالیدگی

بخشتا ہے۔

حفظِ جان و تن (رُوح اور جسم) کا طریقہ بھی اقبال نے بتایا ہے۔ رُوح کی ترقی کے لیے ذکر و فکر بے حساب کی ضرورت ہے۔ جسم کی حفاظت کے لیے موسمِ شباب میں ضبطِ نفس ضروری ہے۔ جوانی کی بے اعتدالیاں ہی انسانی جسم اور اس کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ جاوید کے نام لندن سے ایک منظوم خط میں بھی اس جانب اشارہ کیا ہے ؎

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ!

ترویجِ خودی کا پانچواں اُصول صدقِ مقال اور اکلِ حلال ہے۔ اس اصول میں اسلام کا عمرانی اور معاشی نظریۂ حیات بیان کیا گیا ہے۔ صدقِ مقال یعنی پاک باطن، نیک کردار اور راستباز۔ اکلِ حلال یعنی محنت سے روزی کمانا اور ذریعۂ معاش کا جائز طریقہ اختیار کرنا۔ "سرِّ دینِ مصطفےٰ" اِن ہی دو باتوں میں مضمر ہے۔ انسان خلوت میں ہو تو پاک باطن اور جلوت میں آئے تو جائز حصولِ معاش کے ساتھ ؎

سرِّ دیں صدقِ مقال، اکلِ حلال خلوت و جلوت تماشائے جمال!

اس مقام پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ دین کیا ہے؟ دین طلب میں جلنے کا نام ہے، اس کا آغاز ادب اور انجام عشق ہے۔ آبروئے انسان بھی ادب اور عشق سے ہے۔ بے ادب انسان ایک ایسا پھول ہے جس میں رنگ ہے نہ خوشبو۔ اقبال بڑی دلگیری سے کہتے ہیں جب میں کسی نوجوان کو بے ادب پاتا ہوں تو میرا دن رات کی طرح تاریک ہو جاتا ہے۔ دل میں ایک اضطراب پیدا ہوتا ہے اور عہدِ رسالت کی یاد آتی ہے، جب ادب کے قرینے سکھائے گئے تھے۔ اس قوم کے وارث بے ادب اور بے حیا ہوں تو ندامت سے میں پانی پانی ہو جاتا ہوں ؎

نوجوانے را چو بینم بے ادب روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا یادِ عہدِ مصطفےٰ آید مرا!
از زمانِ خود پشیماں می شوم در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم!

اس کے بعد وہ نوجوانوں کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، وہ ہے ستر زن و مرد ؎

سترِ زن با زوج یا خاکِ لحد سترِ مرداں حفظِ خویش از یارِ بد!

عورت کا ستر اُس کا شوہر ہے یا پھر آغوشِ لحد! مرد کا ستر اپنے آپ کو "یارِ بد" سے محفوظ رکھنا ہے۔ "یارِ بد" کو گرے ہوئے مذاق کے ساتھی سے لے کر ہر دو صنف میں جہاں تک جی چاہے وسعت دے لیجئے۔ حرفِ بد اور گالی گلوچ آدمی کے شایانِ شان نہیں ؎

آدمیّت، احترامِ آدمی! باخبر شو از مقامِ آدمی!

کامل ہونے کے لیے سفر کو بھی ایک شرط ٹھیرایا ہے۔ سفر انسان کی نظر میں وسعت مشاہدہ میں پختگی اور معلومات میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ بسا اوقات سفر معاشی خوشحالی کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ جس طرح ہلال سفر کے بعد بدرِ کامل بنتا ہے اسی طرح انسان بھی ترقی کے مراحل کو طے کرتا ہے۔ ایک مقام پر تلاشِ معاش زاغ و زغن کا طریقہ ہے، شہباز وسعتِ کائنات میں اپنا رزق تلاش کرتا ہے۔ ؎

رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و ہور!

آخر میں اقبال نے نوجوانوں کو چند عام نصیحتیں بھی کی ہیں جو ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہیں: "خدا سے دردِ دل کے سوا کوئی اور چیز نہ مانگ، کسی کے آگے ہاتھ مت پھیلا نعمتوں کی بہتات دل سے گداز چھین لیتی ہے اور نیاز دل کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ غیرِ حق اور حرام سے بچنا بڑا کمال ہے، رُوح میں بلندی پیدا کرنے کے لیے حرص اور خواہش کا خاتمہ ضروری ہے۔ خوف اور غم، ضعفِ ایمان کی نشانیاں ہیں۔ نوجوانو! غم قاتلِ زندگی ہے، وہ انسان کو نصف بوڑھا بنا دیتا ہے۔ حرص سے بچو کہ یہ ہر وقت کی فقیری ہے!

من فدائے آں کہ درویشانہ زلیست
وائے آں کو از خدا بیگانہ زلیست!"

کراچی میں

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے ذیلی دفتر کے لئے سنّی پلازا عقب میکلوڈ روڈ
میں جگہ حاصل کر لی گئی ہے جو ابھی زیرِ تعمیر ہے۔
فی الحال کراچی میں انجمن اور مکتبۂ انجمن کا پتہ حسبِ ذیل ہے:

قاضی عبدالقادر ۲/۲ A V ناظم آباد (فون: ۶۱۳۳۷۷)

ڈاکٹر اسرار احمد

تیسری قسط

شرک اور اقسامِ شرک[۱]

شرک فی الصّفات (۱)

شرک فی الصّفات پر گفتگو سے قبل شرک فی الذّات کے ذیل میں اس بنیادی بات کی مزید وضاحت مفید رہے گی کہ شرک فی الذّات درحقیقت اعتقادی شرک ہے صرف عملی نہیں ہے بلکہ اس میں اعتقادی شرک بہت مضبوط جڑیں رکھتا ہے۔ نیز یہ کہ یہ شرک جلی ہے، شرک خفی نہیں ـــــ شرک فی الصّفات کا معاملہ ذرا اس سے مختلف ہے۔ اس کا معاملہ قدرے خفی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اگر انسان ہوشیار اور چوکس نہ رہے، چوکنّا اور محتاط نہ رہے تو اس بات کا اندیشہ موجود رہے گا کہ وہ غیر شعوری اور غیر محسوس طریقہ پر شرک فی الصّفات کا مرتکب ہو جائے اور اُس میں ملوّث ہو جائے۔

اشتراکِ لفظی اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں بعینہٖ وہی الفاظ ہم مخلوق کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کو ہماری زبان کی تنگ دامنی کہہ لیجئے کہ ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے جدا الفاظ نہیں ہیں بلکہ حق تعالیٰ سُبحانہٗ کی صفات کی تعبیر کے لیے جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہی مخلوق کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ البتہ ان استعمالات میں ایک عظیم فرق موجود ہوتا ہے یعنی وہی لفظ اگر خالق کے لیے بولا جائے تو اُس کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور مخلوق کے لیے بولا جائے تو کچھ اور ـــــ اگر یہ فرق پیشِ نظر نہ رہے، مستحضر نہ رہے تو غیر شعوری طور پر انسان شرک فی الصّفات میں ملوّث ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ وجود اللہ کی ایک صفت ہے، لیکن ہم بھی موجود ہیں لہٰذا اسی صفت وجود سے خدا بھی متصف ہے اور ہم بھی ـــــ خدا کی ایک صفت علم ہے اسی صفت کا اطلاق ہم مخلوقات پر بھی کرتے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ بڑے مبالغے کے ساتھ بھی کہتے ہیں۔ عربی زبان میں علّام یا علّامہ مبالغے کا لفظ ہے، یہی صفت اللہ کی بھی ہے، وہ عالم ہے، علیم ہے، علّام الغیوب ہے، اور ہمارے ہاں بھی نہ معلوم کتنے لوگ ہیں جن پر ہم علّامہ کی صفت

کا اطلاق کرتے ہیں۔ چند اور مثالیں دیکھ لیجئے۔ بصارت ہے، سماعت ہے، ارادہ ہے، حکمت ہے، قدرت ہے، حیات ہے۔ ان تمام صفات سے اللہ تعالیٰ بھی متصف ہے اور ہم بھی ـــــ وہ بصیر ہے، سمیع ہے، صاحبِ ارادہ ہے، حکیم ہے، قادر و قدیر ہے، حیّ ہے تو ہم بھی ان صفات سے متصف ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس لفظی اشتراک کی وجہ سے انسان میں ایک وہم پیدا ہوتا ہے اور وہ ایک زبردست مغالطہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ چوکس، چوکنا اور ہوشیار و محتاط نہ رہے تو اس باب میں زبردست ٹھوکر کھا سکتا ہے۔

احتیاط کیا ہے؟ اس ضمن میں ہم کو جو احتیاط ملحوظ رکھنی ہے اور جس شرط و قید کو مستحضر رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ صفات جن مفاہیم میں خدا کے لیے مستعمل ہیں، وہ اس مفہوم سے بالکل جدا ہیں، جن کا اطلاق مخلوق پر کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں، بلکہ زمین و آسمان کا فرق ہے اور یہ بات بھی میں نے محض سمجھانے کی غرض سے کہی ہے ورنہ حقیقتِ نفس الامری تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ جن صفات سے متصف ہے اور اس سے مشابہ جو صفات کسی مخلوق میں پائی جاتی ہیں اُن میں سرے سے کوئی نسبت و تعلق ہے ہی نہیں اور نہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس فرق و تفاوت اور اس بات کو انسان اچھی طرح سمجھ لے، پورے شعور کے ساتھ جان لے تو پھر اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ شیطان کے اغوا سے خود کو محفوظ رکھ سکے اور شرک فی الصّفات میں ملوّث نہ ہو سکے!

اس تمہیدی گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ ہم کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ صفاتِ الٰہی کے بیان و تعبیر کے لیے الفاظ وہی ہوتے ہیں جو مخلوق کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن جب ان کا اطلاق خالق پر کیا جاتا ہے تو اُن کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور جب ان ہی صفاتی الفاظ کا اطلاق مخلوق میں سے کسی پر کیا جائے گا تو ان کے معانی و مفاہیم بالکل بدل جائیں گے۔

فرق و تفاوت کیا ہے؟ اب میں چاہتا ہوں کہ اس فرق و تفاوت کو تین نکات کے ذریعے سے اپنے ذہن نشین کر لیجئے۔ خوب اچھی طرح اپنے ذہن میں جما لیجئے حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور ماسوا یا مخلوق کی ذات و صفات میں تین بنیادی فرق ہیں

● پہلا نکتہ اور فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی اس کی اپنی ہے۔ کسی اور نے اس کو وجود نہیں بخشا بلکہ وہ از خود ہمیش سے ہے اور ہمیش رہے گا۔ جبکہ ماسوا جو کچھ بھی ہے اس کی ذات اور اس کا وجود عطائی ہے۔ اُس کو خدا نے بخشا ہے۔ پھر یہ کہ مخلوق میں

کسی کو بھی دوام و بقا حاصل نہیں ہر ایک کے لیے فنا لازم ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (سورۃ الرحمٰن - ۲۷) "ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہونے والی ہے اور صرف تیرے ربِّ جلیل و کریم کی ذات ہی باقی رہنے والی ہے"

● دوسرا نکتہ اور فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی ذاتی ہیں، کسی اور کی عطا کردہ نہیں ہیں۔ لیکن مخلوق کی صفات کُلّیتہً عطائی ہیں، خدا کی عطا کردہ ہیں۔ کسی میں بھی اپنی ذاتی صفت کوئی نہیں ہے جب وجود ہی اپنا نہیں عطائی ہے تو ظاہر بات ہے کہ صفت تو اس پر عارض ہوگی، اس پر مزید اضافے کے طور پر واقع ہوگی تو اس کی ذات بھی مستعار (یہ لفظ ہماری زبان میں کثرت سے اس طور پر مستعمل ہے کہ ہم "حیاتِ مستعار" بولتے ہیں) اور اس کی صفات بھی عطائی ـــ مخلوق کی زندگی کی مہلت بھی عارضی، لہٰذا اس کی صفات بھی عارضی۔ حیات بھی عطائی اور صفات بھی عطائی ـــ دینے والے نے جو اجل مقرر کر دی ہے اس سے پلک جھپکنے کے برابر بھی اضافہ پر کسی کو قدرت نہیں۔

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ (المنافقون: ۱۱) اور جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ کسی شخص کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا۔

پس مخلوق کی تمام صفات اس کی ذات ہی کے مانند عطائی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اس کی ذات کے مانند اس کی اپنی اور ذاتی ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اس نکتے کی مزید وضاحت کر دوں چونکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ انسان کو اس میں مغالطہ لاحق ہو ہی جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی مزید تشریح ان شاء اللہ العزیز مفید مطلب رہے گی۔

اسی ضمن میں یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ اللہ کی ذات بھی قدیم ہے اور اس کی صفات بھی قدیم ہیں۔ ماسوا اور مخلوق کا مطلب ایک ہی ہے چونکہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ ماسوا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جو خلّاق ہے، اُس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ مخلوق ہے۔ ماسوا کی ذات اور صفات دونوں حادث ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ازل سے ہے ـــ یہ ازل کا لفظ بھی بطورِ مجاز و تفہیم اللہ کے لیے بولا جاتا ہے ورنہ اس لفظ میں بھی ایک محدودیت ہے

چونکہ "ازل" میں کسی سلسلہ کے آغاز کا تصوّر موجود ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ذات وصفات کے لیے کسی شروعات کا تصوّر درست نہیں۔ یہ لفظ مخلوق کو خالق کی قدامت کا ایک تصوّر دینے کے لیے تو حقیقی ہوسکتا ہے لیکن خود خالق کے لیے یہ لفظ مجازی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ جب سے ہے اور ہمیشہ سے ہے، اُس کی تمام صفات بھی بکمال وتمام اُس کی ذات کی طرح قدیم ہیں۔ اس کی شان تو وہ ہے جو سورۂ حدید میں یوں بیان ہوئی کہ: هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ

اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے، یہ بات نہیں ہے کہ کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو جائے تو اس کے علم میں آئے بلکہ وہ تو مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ کی شان کا حامل ہے۔ اس کا علم کامل ہے، اس ہستی تبارک وتعالیٰ کی صفتِ علم کا معاملہ ہماری صفتِ علم کی طرح نہیں کہ جو عمر، تعلیم اور تجربہ کی بنا پر بڑھتا رہتا ہے اور کسی عارضہ و حادثہ کی وجہ سے معدوم و محو بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی کوئی کیفیت اللہ کی صفتِ علم کے ساتھ وابستہ کر لی جائے تو گویا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کو اس کے مقامِ رفیع سے گرا کر مخلوق کی صف میں لا کھڑا کیا گیا۔۔۔ بعض فلاسفہ کا (جن میں بدقسمتی سے مسلمان بھی شامل ہیں) یہ خیال ونظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف کلیّات کا علم ہے جزویات کے علم سے (نعوذ باللہ) اس کا کوئی تعلّق نہیں۔ یہ بھی گویا اللہ کو مخلوق پر قیاس کرنا ہوا۔ یہ خیال ونظریہ بھی درحقیقت شرک فی الصّفات کے ذیل میں آئے گا۔ چونکہ اپنی روح کے اعتبار سے یہ بھی اللہ کو اُس کے مقامِ بُلند سے گرا کر مخلوق کی سطح پر لا کھڑا کرنا ہوا۔ اور جیسا کہ مَیں نے اپنی تمہیدی گفتگو میں عرض کیا تھا کہ شرک کی جامع تعریف وتعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کو اس کے مقامِ ارفع واعلیٰ سے گرا کر اس کو مخلوق کی صف میں لا کھڑا کیا جائے یا مخلوق میں سے کسی کو اٹھا کر اس کو اللہ تبارک و تعالیٰ عزّ وجلّ کے برابر لا بٹھایا جائے۔"

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور وجود قدیم۔ مخلوقات میں سے ہر مخلوق کی ذات و وجود حادث ۔۔۔ اور اللہ کی تمام صفات اس کی اپنی ذات کی طرح قدیم، اس کی اپنی ذاتی اور ہر لحاظ سے کامل و اکمل۔ مخلوق کی صفات عطائی اور ناقص ومحدود۔

● تیسرا نکتہ اور فرق یہ ہے (اور یہ مفہوم، معنی اور مطلب کے لحاظ سے بہت اہم اور عظیم

ہے) کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات ہی کے مانند مطلق (Absolute) ہیں۔ ان پر کوئی حدود و قیود عائد نہیں ہیں، نہ وہ کسی خارجی تعاون و اعانت کی محتاج ہیں۔ مثلاً وہ بصیر ہے تو اُس کی یہ صفت مطلق ہے جب کہ ہماری صفت بصارت محدود و مشروط ہے۔ ہماری آنکھ میں بینائی کی صلاحیت ہو، خارج میں روشنی بھی موجود ہو تو ہم دیکھ سکیں گے۔ بصارت موجود ہے لیکن خارج میں روشنی موجود نہیں، گھُپ اندھیرا ہے۔ یا ہم کسی انتہائی تاریک تہہ خانے میں مقیّد ہیں تو بصارت ہوتے ہوئے بھی ہم دیکھنے سے قاصر و معذور ہیں۔ اسی طرح خارج خوب روشن ہے لیکن بدقسمتی سے ہم "بینائی" سے محروم ہیں، تو بھی "دیکھنے" سے قاصر رہتے ہیں ـــــ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا علم انتہاہ ہے، اُس کی کوئی حد نہیں ہے جس کو ماپا جاسکے وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کی شان کا حامل ہے۔ اس کی قدرت لامحدود ہے، اُس کی سرحدیں نہیں جن کا تعین کیا جاسکے، وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ اس کی قدرت کا عالم تو یہ ہے کہ وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے اور اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ کی شان کا حامل ہے!!

مختصراً یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی مطلق ہے جس کو انگریزی میں THE ABSOLUE BIENG سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــ ذاتِ مطلقہ ـــ اسی طرح اس کی تمام صفات بھی مطلق ہیں وہ کسی حدود یا قیود سے آشنا نہیں ـــ اس کے برعکس ماسوا اور مخلوق کی جملہ صفات محدود و مقیّد ہیں، جیسا کہ میں ابھی بطورِ افہام بصارت کی صفت کے متعلق عرض کر چکا۔ اب اگر مخلوق میں سے کسی کی کسی صفت کے ساتھ اطلاق کا کوئی تصور ذہن میں قائم ہو جائے گا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسی اعتبار سے انسان نے خالق کو مخلوق کے ہم پلّہ اور ہمسر بنا دیا۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ چونکہ ہماری زبان میں خالق اور مخلوق کی صفات کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اُن میں باہمی اشتراک ہے لہٰذا مغالطہ اور التباس کا پیدا ہو جانا عین قرینِ قیاس ہے۔ جس سے محفوظ رہنے کے لیے اس کی معرفت ضروری ہے!

ایک ضروری وضاحت اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں ایک اہم بات مزید اچھی طرح جان لیجیے کہ وہ لامتناہی ہیں۔ ان کی نہایت کا کوئی تصور بھی انسان کے محدود ذہن کے لیے ممکن نہیں۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ انسان جس خوبی، خیر اور کمال کا تصور کر سکتا ہے، وہ بدرجۂ اتم و اکمل اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا

الرَّحْمٰنَ ط اَيًّامَّاتَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ج (۱۱۰) "اے نبی! اُن سے کہہ دو کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں"۔

اسی طرح سورۃ الحشر میں آیات ۲۲ تا ۲۴ اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء کا جو بیان ہوا ہے، جس کو ایک حسین گلدستہ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، اُس میں بھی فرمایا: لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ ان دونوں مقامات پر حصر کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے یعنی حقیقتِ نفس الامری یہی ہے کہ ہر اچھا نام اُسی ذات تبارک وتعالیٰ ہی کے لیے سزاوار ہے۔

صفات واسمائے الٰہی کے باب میں اہم بات | جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ و احصار انسان کے ذہنی افق کے لیے ممکن نہیں، اسی طرح اس کی صفات کا شعور وادراک انسانی عقل کا روگ نہیں۔ شعور وادراک تو دور کی . . . بات ہے، اس کا کوئی تخیل و تصور بھی انسان کی استعداد سے ماوراء ثم ماوراء ہے۔ اسی بات کا اُمتِ محمدؐ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے سب سے بڑے عارف حضرت ابو بکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یوں اظہار کیا تھا کہ: ع اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الذَّاتِ اِدْرَاکٌ ۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ نے یوں گرہ لگا کر مضمون کو مکمل کیا کہ: ع وَالْبَحْثُ عَنْ کُنْہِ الذَّاتِ اِشْرَاکٌ ۔

صفاتِ الٰہی سے ہمارا ذہنی رابطہ | پس انسان صفاتِ الٰہی کے ادراک سے بالکل عاجز ہے۔ البتہ اس کی ذاتِ تبارک وتعالیٰ سے ہمارا ایک ذہنی رابطہ اسؐ کے ان اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ ہی قائم ہو سکتا ہے جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئے ہیں اور ان تمام اسمائے حسنیٰ کو ماننا اور تسلیم کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ لیکن اس کی کیفیت وکمیت کا اندازہ ہمارے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے لیے صرف ایک پناہ گاہ ہے اور وہ ہے لفظ کُلّ ــ جیسا کہ فرمایا کہ: وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اور: وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ط

ایک بات اور بھی جان لیجئے کہ قرآن وحدیث میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ پر ایمان ویقین کے ساتھ ساتھ یہ بات تسلیم کرنا اس ایمان ویقین کے مقتضیات میں سے ہے کہ دنیا میں جو بھی قدرت وکمال اور حسن وجمال جن جن اعتبارات سے موجود ہے وہ بہ تمام وکمال اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود ہیں اور جس طرح اس کی ذات قدیم ہے اُسی طرح اُس کی صفات بھی قدیم ہیں اور تمام صفات بیک وقت موجود ہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم میں جہاں اس کے ایک سے زائد اسماءُ الحسنیٰ بیان ہوتے ہیں ان کے درمیان واوِ عطف نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں نے سورہ حشر کے آخری

رکوع کی آخری آیات کا حوالہ دیا کہ : هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

احتیاطی تدابیر | میں تفصیل سے عرض کر چکا کہ صفاتی اسماء کے لفظی اشتراک کی وجہ سے التباس و مغالطہ لاحق ہو جانا عین قرین قیاس ہے جس سے محفوظ رہنے کے لیے تین اصولوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے اور میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ان کو الجبرا کی Equation اور اُس کے فارمولوں کی طرح اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے :

- خدا کی ذات بھی قدیم اس کی صفات بھی قدیم۔ ماسوا (مخلوق) کی ذات بھی حادث اور اُس کی صفات بھی حادث۔
- خدا کی ذات مطلق (ABSOLUTE) ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد و منزہ اور اس کی صفات بھی مطلق و اکمل۔ حدود و قیود (LIMITATIONS) سے ناآشنا ــــ ماسوا (مخلوق) کی ذات و صفات دونوں محدود۔
- خدا کی ذات و صفات خود اُس کی اپنی ہیں۔ صرف اور صرف وہ ہی الحیّ القیّوم ہے صرف اُسی کی شان ہے کہ : اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ اور سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (سورہ حدید ۱ تا ۳)

ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ کی تسبیح کی ہے۔ آسمانوں اور زمین (کل کائنات) کی بادشاہی (حقیقتاً اور استحقاقاً) اُسی کی ہے وہی ہے جو زندہ رکھتا ہے اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن اور صرف وہی ہے جو ہر چیز کا کامل علم رکھتا ہے۔

جبکہ ماسوا (مخلوق) کی ذات، اس کا وجود، اُس کی صفات سب کی سب عطائی ہیں۔

ان اصولوں کو تسلیم کرنے کے مثبت نتائج یہ تینوں اصول اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں تو وہ بعض مسائل جو اس سلسلہ میں بڑے ہی مختلف فیہ اور معرکۃ الآرا بن گئے ہیں، اور جن کی شرح و تعبیر میں ہمارے مختلف کلامی مکاتب فکر میں قیل و قال اور بحث و نزاع کا بازار گرم رہتا ہے۔ جن کے باعث گروہ بندیاں حتیٰ کہ مسجدیں اور نمازیں علیحدہ ہو گئی ہیں اور امت کی وحدت کے لیے جو عظیم خطرہ ہیں، وہ تمام مسائل اس طرح حل ہوتے اور سلجھتے چلے جاتے ہیں کہ کوئی التباس، کوئی مغالطہ، کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا اور انسان کو قلبی و ذہنی اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر از خود پہنچ جاتا ہے کہ یہ مسائل بے جان اور بے حقیقت ہیں اور ان کو محض اپنے علیحدہ علیحدہ تشخص کے لیے بحث و نزاع کا موضوع بنا رکھا ہے اور اس کی غایت بحث برائے بحث کے سوا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات یہ بات تقریباً مجمع علیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات اساسی و بنیادی ہیں۔ بقیہ صفات ان ہی کی فروعات، مقتضیات، متضمنات اور مقدرات کی حیثیت رکھتی ہیں ــــ ہمارے متکلمین کے مابین ان بنیادی و اساسی صفات کے بارے میں ایک خفیف اور معمولی اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ پانچ ہیں اور بعض کے نزدیک سات اور وہ یہ ہیں :

(۱) وجود (۲) حیات (۳) علم (۴) قدرت (۵) ارادہ (مشیت) یہ پانچ صفات تو تمام متکلمین کے مابین متفق علیہ ہیں ــــ جو حضرات بنیادی صفات سات قرار دیتے ہیں وہ اس فہرست میں کلام اور سمع و بصر کو بھی شامل کرتے ہیں ــــ میں اس مسئلہ پر صرف نظر کرتے ہوئے کہ یہ بنیادی صفات پانچ ہیں یا سات، صرف چند مثالیں دے کر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے وہ بات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔

چند مثالیں پہلے صفت علم کو لیجیے، میں اس سلسلہ میں اجمالاً پہلے بھی چند اشارات کر چکا ہوں۔ اس صفت علم کو سمجھنے کے لیے ان ہی تین بنیادی اصولوں کو ذہن میں لائیے۔ اللہ کا علم ذاتی ہے، اللہ کا علم مطلق اور غیر محدود اور لامتناہی ہے۔ اللہ کا علم قدیم ہے ماسوا یا مخلوق خواہ وہ ملائکہ ہوں، انبیاء و رسل ہوں، اولیاء اللہ ہوں، کسے باشد۔ وہ حضرت جبریلؑ ہوں جو سرخیل ملائکہ ہیں، یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں جو سید المرسلین و خاتم النبیین ہیں یا وہ اولیاء اللہ میں سے خلفائے راشدین ہوں، عشرہ مبشرہ ہوں، بدری

صحابی ہوں اور اُمت کے صلحاء و اتقیا ہوں، کوئی بھی ہو، ان سب کا علم ماسوا اور مخلوق کی فہرست میں آئے گا ـــــ اگر ان کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ مخلوق نہیں ہیں تو معاملہ بالکل ہی خارج از بحث ہو جائے گا۔ ان کے بارے میں یہ تین باتیں لازماً تسلیم کرنی ہونگی کہ ان کا علم ذاتی نہیں ہے عطا کردہ ہے: وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ (اللہ کے علمِ کامل میں سے کوئی چیز انسانوں کی گرفتِ ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے) اُن کا علم قدیم نہیں ہے، حادث ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی جو قدیم و مطلق شان ہے، اس کو ماسوا (مخلوق) میں سے کسی کے لیے ہم نہیں مان سکتے اور یہ کہ ماسوا (مخلوق) کا علم محدود تھا، محدود ہے اور محدود ہی رہے گا۔ اس کو غیر محدود اور لامتناہی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان تینوں میں کسی ایک کے بارے میں بھی اشتباہ ہو جائے، ان میں سے کسی کو بھی ماسوا (مخلوق) میں سے کسی کے لیے بھی مان لیا جائے تو یہ شرک فی العلم ہوگا۔ لیکن اگر ان تینوں باتوں کو ذہن میں مستحضر رکھا جائے تو وہ شرک نہیں ہوگا

علمِ غیب کی بحث | میں چاہتا ہوں کہ صفتِ علم کے ضمن میں میں نے جو مقدمات قائم کئے ہیں، ان کی روشنی میں علمِ غیب کے مسئلہ کو بھی سمجھ لیا جائے۔ چونکہ اس پر قیل و قال اور بحث و نزاع کا ایک طویل سلسلہ چلا آرہا ہے، اور دو مکاتبِ فکر کے مابین جو چیز یں فرق و امتیاز کی علامتیں بن گئی ہیں، ان میں یہ مسئلہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے تو سارا مسئلہ دراصل لفظِ غیب کی تعریف و تعبیر پر گھومتا ہے۔ جو گروہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علمِ غیب کی نفی کر رہا ہے وہ علمِ غیب کی تعریف (DEFINATION) کچھ اور کرتا ہے اور جو گروہ اس کا اثبات کر رہا ہے اس کے نزدیک علمِ غیب کی تعریف و تعبیر بالکل دوسری ہے۔ لہٰذا اس بحث و تمحیص کا اصل سبب یہ ہے کہ دونوں گروہوں کے نزدیک علمِ غیب کی تعریف (DEFINATION) ایک نہیں ہے۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ساہیوال میں بریلوی مکتبِ فکر کے ایک جید عالمِ دین سے رابطہ قائم کیا اور میں نے اُن سے معلوم کرنا چاہا کہ ان کے ہاں نبی اکرم کے علمِ غیب کے بارے میں اصل عقیدہ کیا ہے؟ انہوں نے مجھے زبانی بھی بتایا اور پھر مجھے اپنے مکتبِ فکر کی بہت سی کتابیں بھی دکھائیں تاکہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ ہم حضور کے علم کے بارے میں یہ تینوں باتیں مانتے ہیں کہ وہ حادث ہے، قدیم نہیں، وہ محدود ہے، لامحدود نہیں وہ عطائی

ہے ذاتی تہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ان تینوں کا اعتراف ہے تو میرا اطمینان ہو گیا۔ فساد جو واقع ہوتا ہے اُس کا سبب عموماً سطحی ہوتا ہے۔ میلاد اور مولود کی محفلوں میں اور عوام الناس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جن کی عظیم اکثریت دین ہی سے نابلد اور دور ہے کجا ان مہمات مسائل کا کوئی درک ہو۔ عام جلسوں میں ان مسائل کو چھیڑا جاتا ہے تو بے علم واعظ اور نعت گو ان حدود کو پھلانگ جاتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ تینوں چیزیں مستحضر رہیں تو پھر شرک فی العلم کا کوئی شائبہ پیدا نہیں ہو گا۔

مسئلہ کا دُوسرا رُخ | رہا یہ معاملہ کہ ہم اس بات کو ماپنے اور اُس کی حدود مقرر کرنے کے لیے بیٹھ جائیں کہ حضورؐ کو غیب کا کتنا علم تھا اور کتنا نہیں، تو یہ درحقیقت ہم اپنی حدود سے تجاوز کریں گے۔ چونکہ نبی اور رسول کا علم نوعیّت کے اعتبار سے ہمارے علم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ہمارا سارا علم، علم بالحواس ہے، یا علم بالعقل ہے۔ ہمارے علم کے یہ دو دائرے ہیں لیکن نبی کا علم، علم بالوحی ہے۔ یہ علم کا تیسرا دائرہ ہے اور یہاں معاملہ مقدار (QUANTITATIVE) کا نہیں بلکہ نوعیّت (QUALITATIVE) کا ہے ـــــ ہمارا علم دراصل حواس و عقل کے دائروں میں محدود ہے۔ ہم حواس کے ذریعہ جو تجربات و مشاہدات کرتے ہیں، اُن سے عقل کے ذریعہ نتائج مترتّب کرتے ہیں۔ مثلاً آنکھ نے کچھ دیکھا، کان نے کچھ سُنا، اس پر عقل نے کچھ سوچا اور ایک نتیجہ برآمد ہو گیا۔ ہمارا سارا علم حواس اور تعقّل و تفکّر کے دائروں میں محدود و محصور اور دائر رہتا ہے۔ اسی تعقّل و تفکّر کے بہت سے شعبے ہیں، جن کو استدلال، استنباط، استشہاد، استنتاج، استخراج کہا جاتا ہے لیکن نبی اور رسول کے علم کی نوعیّت بالکل مختلف ہوتی ہے، اُن کو یقیناً بہت سے غیبی حقائق علم بالوحی کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں جو ہماری دسترس سے ماورا ثم ماورا ـــــ (TOTALLY OUT OF BOUND) کی حیثیّت رکھتے ہیں۔ وہ حقائق جو اس حیاتِ دُنیوی میں ہمارے لیے ہمیشہ ہمیش کے لیے غیب کا درجہ رکھتے ہیں اور جو ہم پر دنیوی حیات کے انقطاع پر منکشف ہوں گے۔ ان اُمورِ غیبی میں سے کچھ کا پردہ ہٹا کر نبی اور رسول کو مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ اور اس پر انزالِ وحی ہوتا ہے جبھی تو وہ نبی قرار دیا جاتا ہے۔ نبی کے لُغوی معنی ہیں: "عظیم خبریں دینے والا" اور دینی اصطلاح میں اس کے معنی ہوتے ہیں: "غیب کی خبریں دینے والا"۔ اُن امور کی خبریں دینے والا جو ماورا الطبیعات ہیں اور جن کا تعلّق عالمِ ملکوتی سے

ہے۔ لہٰذا نبی کے لیے علم غیب کا مطلق انکار کرنا تو گویا نبوت و رسالت کا انکار ہو جائے گا۔ اس استثنیٰ کو خود قرآن مجید بیان کرتا ہے۔ فرمایا کہ :

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ۝

(سورۃ الجن ۲۷ : ۲۸)

وہ (اللہ) عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ سوائے اس رسول کے جس کو اُس نے (نبوت و رسالت کے لیے) پسند کر لیا ہو۔ تو اس (رسول) کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کا عددی حساب اس کے پاس ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے فرمایا کہ :

وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ۝ (سورۃ الانعام ۷۵)

اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین (کائنات) کی سلطنت (کے رموز) دکھاتے تھے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو خاص الخاص معاملہ ہوا۔ حضورؐ کو تو معراج کی سعادت عطا ہوئی۔ شبِ معراج میں حضورؐ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی، جنت اور جہنم کا مشاہدہ کرایا گیا، سدرۃ المنتہیٰ تک باریابی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی ملکوتی شان کی عظیم الشان آیات چشم سر سے دیکھیں۔ چنانچہ سورۂ نجم میں فرمایا : لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ۝ اسی طرح سورۂ اسریٰ (بنی اسرائیل) میں فرمایا : سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اب یہاں لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا کے اجمال میں کیا کیا حقائق مخفی ہیں۔ ان کا ہم ادراک کر ہی نہیں سکتے۔ اگر یہ بات ہماری فکر اور عقل کی محدودیت اور ہماری سمجھ میں آنے والی ہوتی تو پھر یہ اجمال ہی کیوں اختیار کیا جاتا۔ پس اس اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے غیب پر کتنا مطلع کیا تھا۔ ہمارے لیے نہ اس کا حدود اربعہ مقرر کرنا ممکن، نہ اس کی مقدار کا تعین ہمارے لیے آسان۔ چونکہ علم الوحی ہمارے بنیادی ذرائع علم سے بالکل مختلف علم ہے

البتہ یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے کہ حضورؐ کو جو علم عطا کیا گیا، اس میں یقیناً غیب کا بھی ایک حصّہ شامل ہے۔ جو حضرات حضورؐ کے علمِ غیب کا انکار کرتے ہیں، ان کے پیشِ نظر علمِ غیب کی تعریف یہ ہوتی ہے کہ "وہ علم جو کسی کو از خود حاصل ہو"۔ یہ موقف صدفی صد درست اور صحیح ہے۔ اور جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا کہ بریلوی مکتبِ فکر کے علماء بھی اس موقف کے مُقِر ہیں اور ان کے عقاید کی کتب میں یہ بات بصراحت مندرج ہے۔ وہ بھی اس بات کی کُلی نفی کرتے ہیں کہ "نبیؐ کو جو علم بھی تھا چاہے وہ غیب سے متعلق ہو چاہے شہود سے وہ حضورؐ کا ذاتی نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تھا"۔ پس معلوم ہوا کہ سرے سے کوئی نزاع ہے ہی نہیں ـــــ جو لوگ حضورؐ کے علمِ غیب کا انکار کرتے ہیں، وہ اس معنی میں نہیں کرتے کہ حضورؐ امورِ غیبیہ پر مطّلع تھے ہی نہیں اور جو لوگ حضورؐ کو علمِ غیب حاصل ہونے کا اقرار کرتے ہیں، وہ اس مفہوم میں نہیں کرتے کہ حضورؐ از خود غیب کا علم رکھتے تھے ـــــ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے کہ گروہی تشخیص اور علامت کے لیے اس قسم کے مسائل کو خواہ مخواہ بحث و نزاع کا موضوع بنا لیا گیا ہے۔

ایک اہم نکتہ | بات سمجھانے کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ قرآن مجید میں اللہ کے لیے: عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اور عَلَّامُ الْغُیُوْبِ فرمایا گیا ہے۔ اب آپ غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی چیز اور کوئی بات غیب ہے ہی نہیں۔ اس کے لیے تو یہ عالم کون و مکاں بلا قیدِ زماں شہادہ ہی شہادہ اور شہود ہی شہود ہے۔ اس کے علم کا احاطہ ممکن ہی نہیں، جو کچھ ہو چکا ہے جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہو گا وہ اس کے علم میں ہے اور اس کی ذات کی طرح قدیم ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہمیں قرآن مجید کی روشنی میں لفظِ غیب کا ایک خاص مفہوم متعیّن کرنا پڑے گا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے غیب کا کوئی تصوّر صحیح ہے ہی نہیں۔ ہر چیز آنِ واحد میں اس کے سامنے موجود ہے، ہمیشہ سے موجود تھی اور ہمیشہ موجود رہے گی ـــــ اس کی شان تو عالم ما کان و ما یکون ہے لہٰذا یہاں غیب کا کیا سوال! پس نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں لفظِ غیب کا استعمال دراصل ہمارے محدود علم کے اعتبار سے ہوا ہے جو عالم مابعد الطبیعی ہماری نگاہوں سے مخفی ہے، جہاں تک ہمارے حواس کی رہنمائی ممکن نہیں۔ جس کی طرف ہماری فطرت میں صرف چند وجدانی اشارے موجود ہیں، ان پر انبیاء و رسل کی وساطت سے ہم سے ایمان بالغیب لانے کا مطالبہ کیا

گیا ہے۔ ہم کو ملائکہ کے وجود کو ماننا پڑے گا اگرچہ ہماری آنکھیں اُن کو دیکھ نہیں سکتیں ہم ان کا لمس محسوس نہیں کرسکتے، وہ ہمارے حواس سے ماوراء ہیں۔ ہم کو جنت و دوزخ پر ایمان لانا پڑے گا، ہم کو قیامت، حشر و نشر، اور حساب و کتاب پر غرضیکہ آخرت کے بارے میں جو بھی خبریں اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ دیتے ہیں ان سب پر ایمان لانا پڑے گا۔ یہ تمام ایمانیات ہمارے لیے غیب ہیں۔ بلکہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رسالت پر ایمان لانا بھی غیب پر ایمان لانا ہے اور صرف ہمارے لیے غیب نہیں بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لیے بھی غیب تھا، بایں معنیٰ کہ حضرت جبریلؑ کو آتے ہوئے اور وحی کو نازل ہوتے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے دیکھا محمدؐ ابن عبداللہ کو۔ اور حضورؐ کی بحیثیت نبی و رسول تصدیق اور حضورؐ پر ایمان بھی غیب ہی تھا اور غیب ہی رہے گا۔

حضرت ابراہیمؑ کی اپنے والد کو دعوت حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جب نبوّت سے سرفراز کیا گیا تو آپ نے اپنے والد کو جن الفاظ میں دعوت دی وہ سورۂ مریم میں بیان ہوئے ہیں کہ:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (مریم: ۴۲-۴۳)

یاد کرو جب کہ اُس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں! اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے تو آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے جس علم کا حوالہ دیا ہے وہ درحقیقت علم الوحی ہے۔ پس قرآن حمید میں اللہ تعالیٰ کے لیے عالم الغیب والشہادہ اور علّام الغیوب میں غیب کا لفظ اس معنیٰ میں ہے کہ جو حقائق پردے کے پیچھے مستور ہیں اور جو انسانوں کی نگاہوں سے چھپائے گئے ہیں ان پر انسان ایمان لائے۔ ہمارے دین میں اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ انسان کا امتحان اسی میں ہے کہ وہ ان مستور حقائق پر اُسی طرح یقین و ایقان رکھے جس طرح وہ اپنے حواس کی گرفت میں آنے والے حقائق پر ایمان رکھتا ہے۔

انبیائے کرام کی اہم خصوصیّت ماوراءالطّبیعات کے بعض اہم حقائق کو انبیائے کرام

علیہم السّلام پر منکشف کیا جاتا ہے اور اُن سے اُن کو مطّلع کیا جاتا ہے، اسی ذریعۂ علم کا نام وحی ہے اور یہی نزولِ وحی نبوّت کا خاصّہ ہے اور اس خصوص میں سرِفہرست ہمارے نبی جناب محمّد صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم جو نبی آخر الزّماں بھی ہیں اور خاتم النبیین اور سیّد المرسلین بھی حضورؐ کی شان تو یہ ہے کہ صبح و شام حضرت جبریلؑ سے ملاقاتیں ہیں۔ حضرت جبریلؑ قرآن حکیم بھی حضورؐ کے قلب مبارک پر نازل فرما رہے ہیں: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (بقرہ ۹۷) نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ (الشّوریٰ ۱۹۳-۱۹۴) إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ (التّکویر ۱۹-۲۰) حضورؐ کی تعلیم پر بھی مامور ہیں، عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ (النّجم ۵) نبی اکرمؐ اُن کی امامت میں نماز ادا فرماتے ہیں۔ ہر رمضان میں جتنا قرآنِ کریم نازل ہو چکا ہوتا ہے اُس کا حضرت جبریلؑ کے ساتھ دَور فرما رہے ہیں۔ اسی حیاتِ دنیوی کے آخری رمضان المبارک میں یہ دَور دو مرتبہ ہوتا ہے۔ نبی اکرم حضرت جبریلؑ سے شکوہ بھی فرماتے ہیں کہ دیر دیر سے کیوں آتے ہیں، آپ کو جلد جلد آنے میں آخر کیا امر مانع ہے! غرض کہ یہ سارا معاملہ پیش آ رہا ہے حضرتِ جبریل علیہ السلام کے ساتھ، جو ہمارے لیے قطعی غیب ہیں۔ معراج تو نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی وہ خصوصیت و فضیلت ہے کہ جس میں کوئی اور دوسرا نبی شریک نہیں۔ اس عالمِ ارضی سے عالمِ ملکوتی میں جسمِ اطہر کے ساتھ حضورؐ کو بلایا جاتا ہے۔ مختلف آسمانوں پر مختلف جلیل القدر انبیاء و رُسُل سے ملاقاتیں ہو رہی ہیں، جنّت و دوزخ کا مشاہدہ کرایا جا رہا ہے۔ پھر سدرۃ المنتہیٰ تک رسائی ہو رہی ہے۔ جہاں تک پہنچنے کی جبریلِ امینؑ کو بھی اجازت نہیں ہے۔ اس اعتبار سے نبی اکرمؐ کے لیے علمِ غیب ہی نہیں مشاہدۂ غیب بھی ثابت ہے، لیکن یہ کہ کُل غیب، سارا غیب، مطلق غیب، ما کان و مایکون کا علم حضورؐ کو حاصل نہیں تھا۔ قرآن مجید اور احادیث شریفہ نیز نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مطہّرہ کے بعض اہم واقعات اس پر شاہد ہیں۔ بطورِ مثال عرض کرتا ہوں کہ واقعہ فدک حضورؐ کی زندگی میں ایک انتہائی ذہنی اذیّت کا باعث تھا۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگتی ہے، جس کا ذکر زبان زدِ عام ہو جاتا ہے۔ یہ تہمت نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے گوشِ مبارک تک بھی پہنچتی ہے۔ ذرا چشمِ تصوّر سے دیکھیے کہ قلبِ محمّد علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام پر کیا بیت

گئی ہو گی۔ ایک عام شریف انسان پر بھی بیوی کی عصمت پر تہمت لگنے سے آسمان ٹوٹ پڑتا ہے اور حضورؐ تو اشرف الاشراف اور اکرم الخلائق ہیں۔ نوعِ انسانی کا عطر و جوہر ہیں۔ دنیا میں سب سے افضل انبیاء و رسلؑ کی جماعت ہے اور حضورؐ اس مبارک طائفہ کے سرخیل و سردار ہیں، سید المرسلین ہیں، خاتم النبیین اور محبوب ربّ العالمین ہیں، سیّد ولد آدم ہیں، سرورِ عالم ہیں (صلّی اللہ علیہ وسلّم وفداہ ابی واُمّی) لیکن انسانی غیوروں میں سب سے اکبر و اعظم غیورؐ کے دل پر کیا بیت رہی ہے؟ ذاتی علم غیب ہوتا تو خود ہی فرما دیتے کہ:۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ٥ لیکن تین دن کے قریب رحمۃ للعالمین شدید ترین ذہنی کوفت میں مبتلا رہے۔ ذاتی علم کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہ کر پائے آخر کار سورۂ نور میں حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برأت خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تو دلِ بے قرار کو قرار آیا۔

پس معلوم ہوا کہ حضورؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے مطلق علمِ غیب کا عقیدہ "شرک فی العلم" ہو گا۔ اسی طرح حضورؐ کے غیب کے علم کی کامل نفی بھی دراصل حضورؐ کی رسالت و نبوت کے انکار کے مترادف ہو گی۔

اصل حقیقت ہمارے ہاں جو مختلف مکاتیبِ فکر پائے جاتے ہیں، ان کے عقائد دراصل اشعریہ و سے ماخوذ ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں اور یہ عقائد، عقیدۂ توحید سے متصادم نہیں۔ کلامی انداز کی تعبیرات میں چند اختلافات ہیں لیکن اساسی طور پر کوئی اختلاف نہیں۔ بدقسمتی سے عالم نما جہلا اور بے علم واعظین نے عوام الناس کی دین سے ناواقفیت سے فائدہ اٹھانے اور اپنی مذہبی سیادت کا قلادہ عوام کی گردنوں پر لادنے اور اپنے مدرسوں کے لیے اپنے اپنے حلقۂ اثر سے مالی تعاون حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے مسائل کو بحث و نزاع کا موضوع بنا رکھا ہے تاکہ ان کا علیحدہ تشخص باقی رہے اور اس قسم کی تفرقہ بازی سے ان کی مذہبی سیادت و قیادت اور سیاست بھی قائم اور چمکتی رہے اور دنیا میں ان کی وجاہت اور قدر و منزلت ہو اور ان کی خطابت اور نکتہ آفرینی کی شہرت ہو۔

شرک فی الصّفات کے ضمن میں مَیں نے جو فارمولا آپ کے سامنے رکھا ہے اس فارمولے کو جب آپ ان مسائل پر APPLY کریں گے جن کی وجہ سے ہماری وحدتِ ملّی میں

تشگاف ڈالے گئے ہیں تو یہ سارے اختلافات متاعِ غرور (دھوکے کی پونجی) کے سوا کچھ نظر نہیں آئیں گے، اور ہمیں کوشش کرنی ہوگی کہ ان اختلافات کی خلیج کو حکمت کے ساتھ پاٹا جائے۔ (جاری)

(نوٹ از مرتب: شرک فی الصفات کی گفتگو بھی باقی ہے جو ان شاء اللہ اگلی قسط میں مکمل ہوگی۔)

بقیہ علماء کی ذمہ داریاں از صـ۲۶

کمی کی علامات ہیں۔

خاصّتاً کسی علمی مسئلہ میں اختلاف کو علمی سطح پر زیرِ بحث لانے کی بجائے جذباتی رنگ دینا اور عوام کے سامنے لے جا کر رکھ دینا، جو نہ اس بحث سے متعلق سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور اور نہ ہی محاکمہ کرنے کے اہل ہیں۔ ایسا کرنا اہلِ علم لوگوں کا کام نہیں۔ یہ طریقہ کسی اور کے لیے صحیح ہو تو ہو، البتہ علماءِ کرام کے عظیم و جلیل منصب سے فروتر بات ہے، اس سے احتیاط لازم ہے۔

آخری گذارش علماءِ کرام کو چاہیئے کہ وہ فراست و بصیرتِ مومنانہ سے کام لے کر ہر اُس تحریک کی سرکوبی کو اپنا اہم اور اوّلین فریضہ سمجھیں جو مسلمانوں کے ملّی و اجتماعی مفادات کے منافی اور اُن کے تشخص کو ختم کرنے در پے ہو۔ علماءِ کرام اپنی قیادت کو گروہی تعصب اور حد بندی سے بالا سمجھیں اور اپنے آپ کو فرقہ بندی کے دلدل میں پھنسانے کے بجائے ملک و ملت کی صحیح اور مؤثر رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیں۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ!

عنقریب شائع ہو رہی ہیں
مولانا امین احسن اصلاحی کی دو معرکۃ الآراء
تصانیف
(۱) اسلامی ریاست — (۲) پاکستانی عورت دوراہے پر
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اسلام میں اجتماعیت

مولانا سید محمود الحسن

داعیانِ حق | قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ۔ "مسلم عن ابی ہریرۃ کتاب الایمان۔ ترمذی عن عبداللہ بن مسعود ابواب الایمان جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام" آغاز میں اجنبی تھا اور عنقریب اپنے آغاز کی طرح اجنبیت کے دور میں داخل ہو جائے گا۔ پس ان اجنبیوں کی زندگی قابلِ رشک ہے۔

تشریح: عربی میں غریب اس آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے وطن سے دور اور غیر معروف ہو، پھر نادر اور نئی چیز کو بھی غریب کہتے ہیں۔

مکّہ میں جب آنجنابؐ نے: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی تحریک کا آغاز کیا اور چند پاک رُوحوں نے اسے قبول کیا تو اسلام کے یہ چند پروانے پوری عرب آبادی میں نامانوس اور انوکھے تھے۔ تحریکِ اقامتِ دین شروع شروع میں کچھ ایسی لگتی ہے جیسے ایک معاشرے میں اَن دیکھی، نادر اور اجنبی چیز نے اپنے وجود کا اعلان کیا ہو اور وہ معاشرہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ آپ یہاں کیسے اور کیوں؟

آنحضرتؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ عُروج کے بعد پھر اسلام پر "غربت" (انوکھے، نادر اور اجنبی کے معنی میں) کا دَور آئے گا، اسلام اصلی اور جامع شکل میں نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ لوگ اسلام کے داعیوں اور جاں نثاروں کو عجیب و غریب سمجھیں گے کیونکہ رائج نظاموں اور مقبولِ عام نظریات کی مارکیٹ میں ایسے نظام کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام برپا کرنے والوں کو الحاد اور بے دینی کے دَور میں ہر قسم کے جانی اور مالی خطرات کو انگیز کرنا پڑے۔ ان حالات میں اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کو بارگاہِ نبوّت سے یہ خوش خبری ملی ہے کہ وہ بڑے سعادت مند اور خوش بخت ہیں، اور قابلِ رشک ہے اُن کا یہ مثالی کردار۔ کیونکہ وہ دنیا میں حق کی شہادت دیتے ہیں۔

پانچ باتوں کا حکم | قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ اللّٰہُ اَمَرَنِیْ

مِنَ السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْجِهَادِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجَمَاعَةِ فَإِنَّهُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ إِلَّا أَنْ يُرَاجِعَ (ترمذی عن الحارث الاشعری ابواب الامثال) ـــــ ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تم پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں (کیونکہ) اللہ نے مجھے اُن کا حکم دیا ہے۔ (۱) (امیر کی بات) غور سے سننا۔ (۲) اس کے حکم کی اطاعت کرنا (۳) (اللہ کے دین کے لیے) بے انتہا کوشش کرنا (۴) راہِ خدا میں وطن چھوڑنا[1] (۵) جماعت بن کر رہنا، جو شخص جماعت سے بالشت برابر الگ ہوا اس نے اسلام (کی رسّی) کا پھندا اپنی گردن سے اتار پھینکا الّا یہ کہ وہ دوبارہ جماعت میں لوٹ آئے۔

تشریح: - قرآن مجید نے بتایا ہے کہ نبی صلی اللہ وسلم اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے مبعوث ہوتے تھے۔ آنجنابؐ کے بعد اُمّتِ مسلمہ پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دین کے غلبہ کے لیے اُٹھے۔ انفرادی طور پر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ جو افراد اللہ کی خوشنودی کی خاطر دنیا میں خدا کے دین کو غالب کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ان کے لیے جماعت بنانا ناگزیر ہے۔ جماعت کا نظم ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا۔ اگر افرادِ جماعت، اپنے امیرِ جماعت کی ہدایت اور احکام کو غور سے نہ سنیں اور ان کی اطاعت نہ کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی تقاضا کرتی ہے کہ جماعت کا ایک ایک فرد دین کے غلبہ کے لیے بھرپور زور لگائے۔ جان اور مال کے علاوہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو قربان کر دے، یہاں تک کہ حالات اگر ترکِ وطن کا تقاضا کر رہے ہوں تو محبوبِ حقیقی کی راہ میں اپنے وطنِ عزیز کو بھی خیرباد کہہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّتِ مسلمہ کو اقامتِ دین کی تحریک کے یہ پانچ بنیادی اُصول بتا کر کام کرنے کا نقشہ دے دیا ہے۔

آخر میں فرمایا: "جس نے بالشت بھر جماعت سے علیحدگی اختیار کی اُس نے اسلام (کی رسّی) کے پھندے سے اپنی گردن نکال لی۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص انفرادی زندگی پر قانع ہے، جماعتی زندگی سے پرہیز کرتا ہے، اور نظمِ جماعت کا قائل نہیں ہے۔ اُسے اسلام کا ہمہ گیر تسلّط گوارا نہیں ہے۔ اور وہ ان پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو اسلام کا جماعتی نظام اپنے ہر فرد پر عائد کرتا ہے۔ انفرادی زندگی غیر مسنون ہے۔ کتاب و سنت کا مجموعی مزاج اس طرزِ زندگی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا خصوصاً ہمارے اس پُرفتن دور میں جبکہ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں زندگی کے ہر محاذ پر اسلام کو چیلنج دے رہی ہیں۔

---

[1] ہجرت سے مراد حضورؐ نے یہ امر بھی لیا ہے کہ ہر اُس کام سے بچنا جو اللہ کو ناپسند ہو (ع، م)

روحِ انتخاب

شہیدِ ناز عبداللہ ذوالبجادین رضؓ

از قلم مولینا محمد جعفر شاہ پھلواری
(ماخوذ از رسول نمبر سیارہ ڈائجسٹ)

اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ عبداللہؓ ذوالبجادین کی وفات بھی ہے۔ ان کا قدیم نام عبدالعزیٰ تھا۔ مدینے سے منزل دو منزل کے فاصلے پر کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ بچپن میں باپ نے انتقال کیا تھا۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ اسلام کی آواز کانوں میں پڑی۔ ولی چچا تھا جو تمام مال و اسباب اور جائیداد پر قابض تھا۔ دیدارِ رسولؐ کا شوق عبداللہ کو بے چین کر رہا تھا مگر ظالم چچا کے خوف سے خاموش تھے۔ آخر شوقِ دیدار ہر خوف پر غالب آیا۔ چچا سے خدمتِ نبویؐ میں حاضری کی اجازت چاہی۔ چچا نے خوب مارا، پھر جسم کے کپڑے تک اتار کے گھر سے نکال دیا لیکن ؎ گر تن ہمہ ریزہ ریزہ گردد، ❊ مہرِ تو زجاں رود محال است!

عبداللہ اسی حالتِ عریانی میں اپنی ماں کے پاس آئے۔ ماں نے ایک کمبل دیا، جس کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے ستر پوشی کی، اور ایک بدن کے اوپر ڈال لیا۔ اور اسی حالت میں مدینے پہنچے بیعتِ اسلام کی اور شوقِ شہادت ظاہر کیا۔ اُسی دن سے اُن کا نام عبداللہ اور لقب ذوالبجادینؓ (کملی کے دو ٹکڑوں والا) رکھا گیا، یہ اصحابِ صُفّہ میں داخل ہو گئے۔ دن رات تعلیمِ دین میں بسر کرتے۔ نوجوان تھے قرآن زور دار آواز میں پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن شکایت کی "یارسول اللہ! اُن کی آواز سے نمازیوں کی نماز میں خلل پہنچتا ہے" رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا "اسے کچھ نہ کہو، یہ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر کے آیا ہے" انہی ایام میں سفرِ تبوک پیش آیا۔ عبداللہؓ بھی مجاہدین میں شامل ہوئے، اور حضورِ اکرمؐ سے شہادت حاصل ہونے کے لیے دُعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا "اگر تمھیں راستے میں موت آجائے تب بھی تم شہیدوں میں داخل ہو جاؤ گے" الغرض لشکر روانہ ہوا اور راستے ہی میں عبداللہؓ کو تیز بخار آیا۔ جس سے انہوں نے وفات پائی۔ بوقتِ وفات عبداللہؓ کے سرہانے مقصودِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ جمالِ اقدس پر نظر جمی ہوئی تھی کہ پیامِ اجل آگیا ؎

سہ چہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے — کہ بوقتِ جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

بعض روایتوں میں ہے کہ عبداللہ رضؓ کی تکفین کے لیے حضورؐ نے اپنی چادر مبارک عنایت فرمائی اس لیے کہ خدا اور رسولؐ کی راہ میں عبداللہ رضؓ نے برہنہ ہو کر گھر سے نکلنا گوارا کیا تھا۔ اُن کی تدفین بھی عجب شان سے ہوئی، اَجلّہ صحابہ رضؓ نے قبر کھودی۔ قبر تیار ہونے کے بعد حضورِ اکرمؐ خود قبر میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئے۔ پھر اُٹھ کر کہا: "لاؤ اپنے بھائی کو"۔ حضرت ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ نے اس مبارک اور سراپا ناز لاشے کو سہارا دے کر اُتارا۔ حضورؐ نے فرمایا: ادبا الیٰ اخیکما یعنی عبداللہ عام مرنے والوں جیسا نہیں، اس کو دھیرے دھیرے ادب سے اُتارو سہ

آہستہ برگِ گُل بفشاں بر مزارِ اُو — بس نازک ست شیشۂ دل در کنارِ اُو

بلال رضؓ ہاتھ میں مشعل لیے ہوئے تھے، اس لیے کہ شب کے وقت تدفین عمل میں آئی تھی۔ حضرت رسولِ اکرمؐ نے اس "ہمہ تن فدا" کی لاش کو اپنی گود میں سے کر اُتارا۔ زمین پر لٹا کر ماتھے پر بوسہ دیا اور فرمایا: "آج شام تک مرنے والے سے راضی رہا ہوں، تو بھی اس سے راضی رہنا"۔ حضرت عمر رضؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ جیسے صحابہ رضؓ اسی مرنے والے کی موت پر رشک کرتے رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "اے کاش! اس قبر میں ہم دفن کئے جاتے"۔ ایک عمر رضؓ اور ابنِ مسعود رضؓ پر کیا موقوف ہے؟ دیکھنے والے تو الگ رہے سننے والوں میں کون اہلِ ایمان ہے جو ایسی موت پر ہزار زندگیوں کو قربان کرنے کی تمنا نہ رکھتا ہو!

منم و ہمیں تمنا کہ بوقتِ جاں سپردن — برُخِ تو دیدہ باشم، تو درونِ دیدہ باشی

آدابِ زندگی
ترتیب: سید محمود الحسن فاضل دیوبند
اس کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی کو
ایک ایسی مؤثر اور دلنشین تشریحات کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے
جس سے اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس میں بڑی مدد ملتی ہے یہ ایک
بہترین رفیق اور مونس ہے اُن نوجوانوں کے لئے جو خدا کی زمین پر
خدا کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں اور جو مشغولِ راہ
ہیں اُن راعیانِ حق کے لئے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال
اللہ کے حضور پیش کر رہے ہیں۔
ہم نے اسے اپنی روایات کے مطابق نہایت اعلیٰ معیار
پر شائع کیا ہے۔ ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے ۲۰۰ صفحات۔ سفید کاغذ
آفسٹ کی طباعت۔ قیمت ۱۲ روپے
مکتبہ [illegible]

ابوالکلامیات

(۱) یہ ممکن ہے کہ انسان اپنی سعی و ہمت سے بادشاہی کا تخت حاصل کرلے لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ محلوں میں پکا ہوا دماغ بھی لا سکے۔

(۲) 'الہلال' ۲۷ نومبر ۱۹۱۲ء ـ عید الاضحیٰ کے مضمون سے

اقتباس

"ابراہیم (علیہ السلام) کے دل میں اپنی محبّت کے ساتھ، بیٹے کی محبت گوارا نہ ہوئی اور اسمٰعیلؑ کے پہلو میں اپنے گھر کو دیکھا، تو محبّت نفس و جان کی پرچھائیں نظر آئی۔

عشق است و ہزار بد گمانی!

غیرتِ الٰہی نے اس کو بھی منظور نہیں کیا۔ حکم ہوا کہ پہلے محبّت کے مکان کو ایک ہی مکین کے لیے خالی کردو۔ پھر اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا کہ: "الغیرۃ من صفات حضرۃ الربوبیّہ"

محبّت کی عشق آموزی کا پہلا سبق غیرت ہے اور یہی معنی ہیں اس آیت کریمہ کے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ

سلطانِ محبّت تمام گناہوں کو معاف کرسکتا ہے مگر اُس کی عدالت میں دل کی تقسیم کا کوئی قانون نہیں ہے"

(۳) اصلی سعی اس کی ہونی چاہیے کہ درخت اپنی جگہ پہ مضبوط ہو۔ تم درختوں کے سائے میں آرام و راحت لیتے ہو، لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تمہارے باورچی خانوں میں کونسی شے جلتی ہے؟ ـــ وہ بھی درخت ہے، لیکن جو درخت اپنی قوّتِ نشو و حیات سے محروم ہو جاتا ہے اُس کو کاٹ کر چولہے کے سپرد کیا جاتا ہے۔

پس زندگی صرف قوّت میں ہے، اور اعتماد کی جگہ دل ہے، نہ کہ کسی کی چوکھٹ۔

(۴) سوال چھت کا نہیں بلکہ اُن اینٹوں کا ہے جو بنیاد میں رکھی گئی ہیں۔ یہ بحث فضول ہے کہ دیوار کا کیا حال ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد تو ٹیڑھی نہیں۔

شعر

بہ نشیں در دلِ ویرانہ ام اے گنجِ مراد کہ من ایں خانہ بہ سودائے تو ویران کردم

جہادِ حریّت کے متعلق

(۵) "..... حالانکہ یہاں تو جانوں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال درپیش ہے۔ یہاں ہوس پرستوں کا گزر نہیں۔ اِس میدان کے مرد وہ جان فروشانِ الٰہی اور مجاہدینِ حق پرست ہیں جن کے سر گردنوں پر نہیں بلکہ ہتھیلیوں پر رہتے ہیں!"

ندمد ہر کس را نرسد دعوئ توحید ۔۔۔ منزل گہِ مردانِ موحد سرِ دار است
ترکِ جان و ترکِ مال و ترکِ سر ۔۔۔ در طریقِ عشق اوّل منزل است
بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ۔۔۔ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

(۶) خلوص کے لیے موت نہیں اور حق و صداقت کے لیے ناکامی نہیں۔ دنیا میں ہر چیز مٹ سکتی ہے، پر حق اور صداقت ہی ایک بیج ہے جو پامال نہیں ہو سکتا۔

گر من آلودہ دامنم چہ عجب! ۔۔۔ ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

(۷) دنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی بھی تاج و تخت اور ایوان و محل کے اندر سے نہیں اٹھی ہے بلکہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ ویران جنگلوں، پھونس کے جھونپڑوں اور پہاڑوں کے غاروں کے اندر رہا ہے۔ ....

مجو مقامِ شاہی، کہ در ولایتِ عشق ۔۔۔ گدا بہ تخت نشانند و پادشاہ گیرند
مبیں حقیر گدایانِ عشق را، کیں قوم ۔۔۔ شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلاہ اند

(۸) پیغمبر کی زندگی کا ایک خدّ و خال تقدّس، نزاہت، حلم و کرم، ہمدردیٔ عام اور ایثار ہونا چاہیئے۔ بلکہ عین اس وقت جب کہ اُس پر سکندرِ اعظم کا دھوکا ہو رہا ہو۔ ژرف بین نگاہیں فوراً پہچان جائیں، سکندر نہیں فرشتہ ہے۔ شبلی نعمانی

(۹) سچّا اعتماد پیدا کرنے والوں نے کبھی خود قسمیں نہیں کھائی ہیں بلکہ اپنی استقامتِ اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دُنیا سے لی ہیں۔ اِس نکتے کو خانِ خاناں نے سمجھا تھا ؎

بہ کیشِ صدق و صفا، حرفِ عہد بیکار است
نگاہِ اہلِ محبّت تمام سوگند است

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی
دار الشّفاء ایبٹ آباد

جمیلُ الرحمٰن

حاصلِ مطالعہ

انتخابِ حدیث | مرتبہ مولانا سید محمود الحسن۔ ناشر مکتبہ اسحاقیہ جونا مارکیٹ کراچی ۲۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت چار سو صفحات، کاغذ سفید کتابت دیدہ زیب طباعت آفسٹ
قیمت درج نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی کو محفوظ رکھنے کا کام حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن دورِ اوّل میں حضورؐ کے شمائل، حضورؐ کے ارشادات و اقوال حضورؐ کے معمولات، حضورؐ کے روز و شب کے حالات، حضورؐ کی جلوت و خلوت کے معمولات اور وہ اعمالِ صالح جو حضورؐ کے سامنے صحابہ کرامؓ نے انجام دیئے اور حضورؐ نے ان کو منع نہیں فرمایا کے بیان و روایت کا سلسلہ زبانی جاری رہا۔ چونکہ ایک تو عرب اللہ کی طرف سے بہترین حافظہ کی دولت سے مالا مال کئے گئے تھے، دوسرے اس امر کا امکان تھا کہ یہ چیزیں کتابِ الٰہی یعنی قرآن مجید میں جو وحی متلو ہے، خلط ملط نہ ہو جائیں۔ اس خیر القرون میں صرف گنتی کے صحابہؓ کا ذکر ملتا ہے جو احادیث شریفہ کی کتابت بھی کیا کرتے تھے۔

حضورؐ کے وصال کے بعد خلفاءِ راشدہ ہی کے دور میں قرآن و حدیث کی تعلم و تعلیم اور درس و تدریس کے بے شمار حلقے قائم ہوئے جن میں اجلّ صحابہ کرام دعوت و تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ پھر ایک دور وہ آیا جس میں تدوینِ حدیث کی ضرورت محسوس ہوئی لہٰذا امت کے ہزاروں متقی و صالح انسان احادیث و سُننِ رسول کی جمع و تدوین اور جرح و تعدیل کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اس کام کی بدولت دنیا بہت سے علوم و فنون کے نئے نئے ضابطوں اور قاعدوں سے آشنا ہوئی —— درایت و روایت کا فن، تنقید و تعدیل کا فن جرح کا فن اسی دورِ سعید کی ایجادات ہیں۔ اسمائے رجال کے نام سے راویانِ حدیث کے حالات کی چھان بین کرنے، اُن کی زندگیوں کو پرکھنے، اُن کے تقویٰ و للّٰہیت کو جانچنے، ان کے داعیات، محرکات و مقاصد (MOTIVES) کو متعین کرنے کا ایک عظیم الشان فن وجود میں

آیا اور اس طرح حدیث کی بے شمار کتابیں مدوّن ہوئیں۔ پھر ان کتب و مجموعۂ احادیث کے مراتب کا تعین ہوا۔ اس طرح انسانی تاریخ میں صرف اور صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ ذاتِ گرامی ہے، جن کی زندگی کا چاہے وہ خلوت کی زندگی ہو چاہے جلوت کی۔ چاہے وہ دعوت و تبلیغ کی ہو، چاہے مجاہدہ و قتال کی۔ چاہے قضا اور عدالت سے متعلق ہو چاہے رموزِ سلطنت سے، چاہے وہ معاشرتی زندگی سے متعلق ہو چاہے دینی و اخلاقی تعلیمات اور مواعظ حسنہ سے۔ چاہے آپ کی نشست و برخاست سے متعلق ہو، چاہے آپ کی پسند و ناپسند اور مرغوبات سے، غرضیکہ حضورؐ کی زندگی کا کوئی عمل، کوئی ادا، کوئی لمحہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو محفوظ نہ ہو۔ حضورؐ کی سیرتِ مطہرہ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس طرح محفوظ کر دی گئی ہے کہ آج بھی اُن کے مطالعہ سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چشمِ تصوّر سے پیکرِ محسوس کی طرح ایک مردِ مومن دیکھ سکتا ہے۔ یہی بات حضرت عبداللہ ابن مبارک علیہ الرحمۃ نے فرمائی تھی کہ جن کے معمولات میں یہ بات شامل تھی کہ وہ چھ ماہ تو درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور چھ ماہ بالکل گوشہ نشین ہو جاتے تھے اور روزمرّہ کے ضروری مشاغل کے سوا اُن کا پورا وقت تنہائی میں گزرتا تھا۔ لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ کیا تنہائی میں آپ کا دل نہیں گھبراتا تو اس مردِ صالح نے جواب میں کہا کہ "تم اس شخص کے متعلق تنہائی کا گمان کرتے ہو جس کو چھ ماہ تک اللہ تعالیٰ سے شرفِ ہمکلامی اور حضورؐ کی صحبت میسّر ہوتی ہے"۔ لوگ حیران ہوئے کہ ابنِ مبارکؒ کیسی خلافِ عقل بات کہہ رہے ہیں — ابنِ مبارکؒ لوگوں کی حیرانی بھانپ گئے اور انہوں نے اس اجمال کی شرح یوں فرمائی کہ "اس تنہائی میں جب قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہوں تو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے براہِ راست شرفِ ہمکلامی عطا فرما رہے ہیں اور جب میں احادیث شریفہ کا مطالعہ کرتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں خیر القرون میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیضیاب ہو رہا ہوں"۔

یہ راقم بلا خوفِ تردید عرض کرتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے علاوہ کوئی ایسی دوسری شخصیت نہیں ہے کہ جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ، جس کا ایک ایک قول، جس کی ایک ایک ادا اس طرح محفوظ کی گئی ہو اور یہ دراصل حضورؐ کے آخری نبی و رسول ہونے کی دلیل کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کی عملی تفسیر بھی ہے کہ: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ نیز تا قیامِ قیامت حضورؐ کو تمام نوعِ انسانی کے لیے اُسوۂ کامل بنا

تھا (لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ط) اس لیے بھی ضروری ہوا کہ حیاتِ مبارکہ کا ہر فعل و عمل محفوظ ہو جائے۔

احادیث شریفہ کے بے شمار مجموعے اس وقت دنیا میں موجود ہیں جن کو پڑھنے کے لیے ایک طویل عمر اور مہلت درکار ہے اس کے فہم کے لیے تو انسان کو لاتعداد زندگیاں بھی کفایت نہ کر سکیں۔ ان احادیث کے مجموعوں سے ملّت کے بہت سے علماء نے "انتخابِ حدیث" کے مجموعے مرتّب کئے ہیں۔ ان ہی میں سے زیرِ مطالعہ کتاب "انتخابِ حدیث" بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس انتخاب کی ترتیب و تدوین میں بڑا حُسن اور امتزاج ہے۔ انسان کی ہمہ جہتی زندگی سے متعلّق اس مجموعے میں مستند احادیث جمع کی گئی ہیں اور پھر ہر حدیث کے متن کے اعراب کی صحت کے اہتمام کے ساتھ ہر حدیث کے ساتھ کتبِ احادیث کے ماخذ کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ ترجمہ سلیس اور تشریح انتہائی مؤثر و دلنشین ہے۔ یہ کتاب تبصرہ نگار کو جس قدر پسند آئی ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگست اور اکتوبر کے شماروں میں اس انتخاب کی چند حدیثیں مشتے نمونہ از خروارے ماہنامہ 'میثاق' میں شامل کی گئی ہیں۔ ہم قارئینِ کرام اور خاص طور پر ان حضرات کو جو دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ ان شاء اللہ اس کتاب کو جلد ہی مکتبہ تنظیمِ اسلامی کے لیے بھی منگا جائے گا اور ہمارے مکتبہ سے بھی یہ کتاب دستیاب ہو سکے گی۔

جامع الآراء فی مراتب الخلفاء | تصنیف مولانا سیّد لعل شاہ بخاری۔ سائز $\frac{22\times 18}{8}$ صفحات ۹۶۔ سفید کاغذ۔ کتابت عمدہ، طباعت آفسٹ قیمت ۵۰ / ۶ روپے ناشر مدنی مسجد لائق چوک واہ کینٹ۔

صاحبِ تصنیف کے مقام کے تعیّن کے لیے یہ بات کفایت کرے گی کہ حضرت مولانا السیّد محمد یوسف بنّوری مدّ ظلہ العالی نے موصوف کی ایک کتاب پر جو اظہارِ رائے فرمایا ہے اُس میں یہ جملہ بھی شامل ہے کہ: "ماشاء اللہ اندازِ بیان فاضلہ اور محدّثانہ ہے اور ہر جہت سے قابلِ قدر ہے۔" زیرِ تبصرہ کتاب مولانا بخاری کی تازہ تصنیف ہے جس میں پہلے تو اختصار لیکن جامعیّت کے ساتھ ان فرقوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو اہل السنّت والجماعت سے خارج ہیں اور ضالّ و مضلّ فرقوں کی تعریف میں آتے ہیں۔ پھر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان گمراہ فرقوں کی گمراہی و ضلالت کا نہایت فاضلانہ انداز میں محاکمہ کیا گیا ہے اور امّت کے اکابر علماءِ

فقہاء، محدثین اور مشائخ کی آرا اور دلائل جمع کئے ہیں جن پر فضیلت اور مراتب الخلفاء کے بارے میں اہل السنّت والجماعت کی بنیاد ہے۔ عبداللہ بن سبا جیسے منافق اور دشمنِ اسلام نے عین تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان ذوالنّورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں خلفاءِ راشدین کی فضیلت کے مراتب کے بارے میں بالخصوص اور اکابر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں بالعموم شک و ریب اور غلط فہمیوں اور مغالطوں نے داغ بیل ڈالی تھی۔ اُسی وقت سے عبداللہ بن سبا کی ذریتِ معنوی اس کام میں مصروف ہے تاکہ اُمّت کی وحدت کو پارہ پارہ کر سکے اور حضورؐ کے صحبت یافتہ صحابہ کی عدالت و تقویٰ کو مجروح کر کے اس کے بین السطور نعوذ باللہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تربیت کو ناقص قرار دینے کے ناپاک عزائم پورے کئے جا سکیں۔ یہ کام اور حملہ بڑے منظّم طریقوں سے چودہ سو سال سے کیا جا رہا ہے، اور مختلف رُوپ اور بھیس بدل بدل کر کیا جا رہا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ کاری وار یہ ہے کہ اہل السنّت والجماعت کا لبادہ اوڑھ کر غیر محسوس طریقے سے حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمروؓ ابن العاص اور دوسرے اکابر کے بارے میں سُوئے ظن نیز لوگوں کے اذہان میں تشکیک و تردّد کے کانٹے بوئے جائیں —— افراط و تفریط کا یہ عالم ہے کہ شیخینؓ اور حضرت ذوالنّورینؓ کے دفاع میں بعض حضرات ایسی باتیں رقم کر جاتے ہیں جو ہمارے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں سُوئے ادب قرار دی جا سکتی ہیں۔

الحمدللہ! مولانا سیّد لعل شاہ بخاری نے اس معاملہ میں پُورے حزم و احتیاط سے کام لیا ہے اور مختصر لیکن جامع طور پر اس مسئلہ کا محاکمہ کیا ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ میں تحقیق و جستجو کا ذوق و شوق رکھتے ہیں، ان کو ہم اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں۔

نوٹ: تبصرے کے لیے کافی کتابیں آئی ہوئی ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ رفتہ رفتہ کتابوں پر تبصرہ کیا جاتا رہے۔ (ج-م)

(بقیہ از صفحہ ۶۴) احتیاط کا تقاضا بھی یہ تھا کہ قلم اٹھانے سے قبل وہ ہم سے مطالعہ کرتے کہ سردار صاحب کا خط انہیں دکھایا جائے، اور ایک شہر میں رہتے ہوئے اس میں قطعاً کوئی دقت نہ تھی۔ پھر اگر ہم انہیں سردار صاحب کا خط دکھا دیتے تو انہیں اُن سے رجوع کرنا چاہیئے تھا۔ اور اگر بہت جلدی تھی تب بھی معاملے کی نزاکت کے پیشِ نظر ہمارے نزدیک رحیم آباد کا سفر اختیار کرنے میں بھی تأمّل نہیں ہونا

ایک تلخ اور ناخوشگوار معاملہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

از قلم ڈاکٹر اسرار احمد

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اس عنوان سے جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں اس سے اکثر قارئین کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ یہ صورت سہواً نہیں قصداً ہے۔ ہر معاملے کی طرح اس قضیّہ میں بھی ایک مرحلہ وہ آسکتا ہے جب پورا معاملہ کامل وضاحت کے ساتھ "جو جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے!" کے سے انداز میں بیان کیا جائے۔ لیکن فی الحال ہم چاہتے ہیں کہ معاملہ جن حضرات کے علم میں ہے وہی بات کو سمجھیں اور جو نہیں جانتے وہ نہ ہی جانیں تو بہتر ہے!

'میثاق'، بابت جولائی ۷۷ء میں سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری کے ایک خط کے حوالے سے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ایک خط کا اقتباس شائع کیا گیا تھا جسے 'شمس الاسلام' بھیروی کی اشاعت بابت اگست ۷۷ء میں شائع شدہ ایک مضمون میں "جعلی" قرار دیا گیا۔ (اس پر جو مزید حاشیہ آرائی کی گئی یا ردّے چڑھائے گئے اُن سے ہم فی الحال 'غضِّ بصر' یا صرفِ نظر ہی مناسب سمجھتے ہیں!) اس پر ہم نے گذشتہ اشاعت میں عرض کیا تھا کہ ہم آئندہ شمارے میں سردار صاحب موصوف کا خط شائع کر دیں گے۔ اور پھر معاملہ اُن کے اور 'شمس الاسلام' کے مدیر و مضمون نگار کے مابین ہوگا۔ اسی اثناء میں 'شمس الاسلام' کا شمارہ بابت ستمبر ۷۷ء بھی آگیا جس میں مولانا اصلاحی صاحب کے خط کا عکس شائع کر دیا گیا۔ ہم شکر کرتے ہیں کہ اصل اہلِ معاملہ کے خطوط کی اشاعت کی بالفعل پہل بھی 'شمس الاسلام' ہی کی طرف سے ہوگئی۔ بہرحال اس کی اشاعت سے اس معاملے میں 'شمس الاسلام' کے مدیر اور مضمون نگار بری ہوگئے۔ ہم بھی ذیل میں سردار صاحب کے خط کا عکس شائع کر کے کم از کم اس خط کی حد تک 'فارغ' ہو جاتا

چاہتے ہیں۔ یہ معاملہ اب کلیتہً مولانا اصلاحی اور لغاری صاحب کے مابین ہے۔ سردار صاحب کے خط کا عکس حسبِ ذیل ہے:

بخدمت مکرم و محترم برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ مزاج شریف۔

آج ۱۰ جون ۱۹۷۶ء جمعہ نماز پڑھ کر دفتر آیا۔ محترم مولانا اصلاحی
کی طرف سے آپ کے خط کا جواب میز پر رکھا تھا۔ جواب پڑھا اور اسی وقت
آپ کے عنایت نامہ کا جواب تحریر کرنا شروع کیا۔

مجھے آپ کا ارشاد تھا۔ کہ آپ کے خط کا جواب فوراً ارسال خدمت کر دوں لیکن
میری مشکل یہ تھی کہ اصلاحی صاحب محترم سے اتنی دور بیٹھ کر کیسے اُن سے رابطہ
قائم کرتا۔ یہی کوشش تھی۔ کہ فوراً انہیں خط لکھوں اور جواب آنے پر فوراً
آپ کی خدمت خط لکھوں۔ اس میں میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ مولانا
کے جواب میں اُنکی علالت کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ بس تاخیر کی معافی
چاہتا ہوں۔

مولانا کا جواب آپ کے لئے تسلی بخش نہیں ہے۔ بالمشافہ بات
کا موقع نہ تھا۔ ورنہ بصد ادب اُنکی خدمت میں عرض پیش کرتا اور
التجا کرتا کہ وہ اسرار صاحب کو تنبیہ دیں اور انہیں ایسی مضمون کرانے
سے منع فرمائیں جس سے دل کے نازک آبگینوں پر چوٹ پڑے۔

مولانا محترم کے الفاظ اس ضمن میں نقل کرتا ہوں:—

"شمس الاسلام کے مضمون کے بارے میں آپ نے لکھا ہے تو گزارش
ہے۔ کہ وہ میرے ایماء پر لکھا گیا تھا۔ نہ میرے ایماء پر دوبارہ شائع

گیا ہے کہ گویا میں اس پوزیشن میں ہوں۔ کہ مدیر جریدہ کو آپ کے
باز رکھ سکوں۔ وہ اپنی پالیسی میں آزاد ہیں۔ مجھے اپنا استاد کہتے ہیں لیکن
میری ان سے کوئی ذاتی شناسائی نہیں ہے۔ اُن کے اس کام میں میرا دخل شامل نہیں
تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر اس کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔"

میرے دوست بہر حال اب فقط آپ ہی کی خدمت عرض کر سکتا ہوں۔ کہ مودودی صاحب
سب کے محسن ہیں۔ اُن سے ہم لوگوں نے دین سیکھا ہے۔ اور مسئلہ
بھی کوئی ایسا نہیں ہے کہ اُن کا لحاظ حق بات کہنے میں رکاوٹ نہ ہو سکے۔
بات زیادہ تر معاملہ کی ہے۔ آپ صبر کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو
اجر خیر دیگا۔ بات کو نہ بڑھائیں۔ میں پرسوں کراچی جا رہا ہوں
... سلطان ... کے ہاں مہمان ہونگا۔ وہاں سے بھی کوشش کرونگا
کہ مودودی اس معاملہ پر نظر ثانی کریں۔

چاہتا ہوں۔ کہ یہ خط اسی وقت جاوید آباد روانہ کروں تاکہ
... جانے والی رات کی گاڑی میں خط پوسٹ کر دیا جائے۔ جو
کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک آپ کو مل جائے۔ اس خط کو چند
خط فوراً بند کر رہا ہوں۔ دیگر کوئی موضوع اس وقت زیر قلم نہیں
کیا جاتا۔

والسلام

'شمس الاسلام' کی اشاعت بابت اگست ۷۷ء میں شائع شدہ مضمون کے بعد ہم تو ابھی حیران و ششدر ہی تھے کہ: ع "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟" اور ہمیں اپنے سے زیادہ سردار صاحب پر رحم آ رہا تھا کہ: ع "اِس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی !" لہٰذا اِس کا کوئی سوال ہی نہ تھا کہ اب ہم ان سے مزید کچھ عرض کرتے لیکن سردار صاحب کا کرم کہ انہوں نے خود ہی تحریر فرمایا :

"... شمس الاسلام نظر سے گزرا - مَیں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ ضبط و تحمّل سے کام لیں ــــ مَیں نے محترم خالد مسعود صاحب کو خط لکھ دیا ہے - مجھے اُمید ہے کہ وہ اِس پر غور فرمائیں گے، اور دو دینی حلقوں کے درمیان تعلّقات کو مزید خراب کرنے سے احتراز کریں گے - یہی گذارش آپ کی خدمت میں ہے -

رمضان کا مہینہ ہے - تراویح میں ختمِ قرآن کی وجہ سے لاہور آنے سے معذور ہوں - کوشش کروں گا کہ بعد رمضان لاہور آجاؤں ....

مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مَیں نے کسی جعل سازی سے کام نہیں لیا - آئندہ بھی اللہ تعالیٰ مجھے محفوظ رکھے ! ......"

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے ان خطوط کی اشاعت کے بعد اب معاملہ اصلاً بزرگوں کے مابین ہے - ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے سوائے اس کے کہ نہ ہمیں ایک لحظہ کیلئے بھی سردار صاحب کی جانب سے کسی جعل سازی کا شبہ ہوا نہ اصلاحی صاحب کی طرف سے کسی غلط بیانی کا - ہمارا گمان پہلے بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ مولانا سے سہو ہوا ہے اور یہ اُن کی عمر اور گذشتہ اعصابی علالت کے باعث کچھ زیادہ غیر متوقّع یا نا قابلِ قیاس بھی نہیں ہے - ویسے وہ ہمارے بڑے ہیں جو چاہیں خود کہہ لیں اور جو چاہیں دوسروں سے کہلوا لیں -

اب جب کہ معاملہ براہِ راست ان سے ہے تو ہم "بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است !" کے مصداق اِن شاء اللہ العزیز اس معاملے کی حد تک اپنے قلم کو سرنگوں ہی رکھیں گے !

البتہ 'شمس الاسلام' کے مدیر اور مضمون نگار دونوں سے یہ ضرور عرض کریں گے کہ اگر ہم سے کوئی بغض یا عداوت ہے تو وہ اُسے کسی اور صورت میں نکالیں، بزرگوں کی پگڑیاں اُچھلوانے کا کھیل اگر وہ نادانی سے کھیل رہے ہیں تو خُدارا ہوش میں آئیں اور اگر دانستہ کھیل رہے ہیں تو خدا سے ڈریں - اس معاملے میں کم سے کم (بقیہ صفحہ ۶ پر)

بقیہ 'تذکرہ و تبصرہ' از صفحہ ۴

بقیہ 'تذکرہ و تبصرہ' از صفحہ ۴

ہمارا معاشرہ بقول شخصے افقی اور عمودی دونوں قسم کی تقسیموں (Vertical as well as Horizontal Polaristation) کی زد میں آ جائے گا اور یہ عمل بالآخر کس انتہائی نتیجے تک منتج ہو گا ، یہ اللہ ہی کو معلوم ہے !

الغرض ، ہمارے نزدیک پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کا نقشہ اب پھر کم و بیش وہی ہو گا جو سن ۶۸-۶۹ میں تھا اور وہ عمل پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ دوبارہ جاری ہو جائے گا جسے مسٹر بھٹو نے اولاً خود برسر اقتدار آنے کے لیے بطور زینہ استعمال کیا تھا لیکن بعد میں حکومت کے تمام ذرائع و وسائل کو بروئے کار لا کر پوری قوت سے اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی تھی اور اس میں وقتی طور پر کامیاب بھی رہے تھے — واللہ اعلم !

ہمیں تسلیم ہے کہ افتاد طبع کے اعتبار سے ہم کسی قدر مائل بہ قنوطیت (Pessimist) واقع ہوئے ہیں لیکن اگر رائے کا اظہار کرنا ہی ہو تو دیانت کا تقاضا ہے کہ انسان دوسروں کو وہی کچھ دکھائے جو وہ خود دیکھتا ہو ۔ ہماری خواہش یہی ہے کہ ایسا نہ ہو ۔ لیکن ہمیں دکھائی یہی دے رہا ہے کہ ہم اپنی ہمالیہ ایسی عظیم غلطیوں اور پے در پے کوتاہیوں کے طفیل اس انجام بد کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں ۔

یہ تو ہے ہمارا اندازہ حالات کے آئندہ رخ کے بارے میں ۔ جس کے لیے خود ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ درست نہ ہو ۔ رہے وہ دو سوال کہ ایسا کیوں ہے ؟ اور اب نجات کی کوئی سبیل ہے کہ نہیں ؟ تو ان کے ضمن میں ان شاء اللہ آئندہ گفتگو ہو گی !

ایک اہم اعلان

'میثاق' کا آئندہ شمارہ ایک خصوصی اشاعت پر مشتمل ہو گا اور اس میں ان شاء اللہ العزیز ایک تو ''اسلام اور پاکستان : تاریخی ، سیاسی ، علمی اور ثقافتی پس منظر'' کے عنوان سے 'میثاق' کے آج سے دس سال قبل کے چند اداریے شائع کیے جائیں گے اور دوسرے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں ''اسلام اور پاکستان : اصل مسئلہ اور اس کا صحیح حل'' کے موضوع پر مفصل گفتگو ہو گی ۔ یہ شمارہ نومبر اور دسمبر کی دو اشاعتوں کے قائم مقام ہو گا اور ان شاء اللہ وسط نومبر تک پیش کر دیا جائے گا

Regd. L. No. 7360

Monthly MEESAQ Lahore

Vol 26 | OCTOBER 1977 | No. 4

از روئے قرآن حکیم

انقلاب نبوی ﷺ کا اساسی منہاج

تلاوت آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت

پر مشتمل ہے !

ڈاکٹر اسرار احمد

کے لاہور میں تین ہفتہ وار درس قرآن :

۱ - ہر بدھ کو بعد نماز مغرب ، قرآن اکیڈمی ، ماڈل ٹاؤن میں جہاں مطالعہ قرآن حکیم کا ایک منتخب نصاب زیر درس ہے ۔

۲ - ہر جمعہ کو صبح ۸-۳۰ بجے، مسجد شہداء ، مال روڈ میں جہاں مسلسل درس قرآن کے ضمن میں آج کل سورۂ مائدہ زیر مطالعہ ہے!

۳ - ہر جمعہ کو ۱۲-۳۰ بجے دوپہر ، مسجد خضراء ، سمن آباد میں جہاں مسلسل درس قرآن کے ضمن میں آج کل بحمداللہ سورہ حج زیر درس ہے ۔

فرمان نبوی ”کن عالماً او متعلماً او سامعاً“ پر عمل پیرا ہو کر زیادہ سے زیادہ تعداد میں پابندی وقت ملحوظ رکھتے ہوئے شرکت فرمائیں ۔

(نوٹ) تینوں مقامات پر خواتین کے لیے پردے کا اہتمام ہوتا ہے ۔